رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۴۰

جلد ۵۸، عدد ۳

جون ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ماہنامہ

ترجمان القرآن

لاہور

جلد ۵۸	ماہ جون ۱۹۶۲ء	عدد ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر
دفتر ترجمان القرآن اچھرہ - لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اگر دریا متلاطم نہ ہو تو اس وقت ہمیں صرف اس کی سطح پر تیرتی ہوئی چیزیں ہی دکھاتی دیتی ہیں۔ اس کی تہ میں جو کچھ بھی موجود ہوتا ہے، خواہ وہ قیمتی موتیوں کی صورت میں ہو یا مٹی اور گارے کی شکل میں، وہ ہمارے نظروں سے یکسر اوجھل رہتا ہے۔ لیکن جب اس دریا میں طوفان اٹھتا ہے تو وہ ساری اشیاء جن تک ہماری نظریں اب تک نہیں پہنچی تھیں وہ خود بخود سطح پر آجاتی ہیں اور ہم پھر بڑی آسانی کے ساتھ ان کا صحیح طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔

قریب قریب یہی حال ہماری زندگی کے دھارے کا بھی ہے۔ یہ دھارا جب اپنے معمول کے مطابق بہ رہا ہو تو اس وقت ہمارے سامنے زندگی کے وہی پہلو آتے ہیں، جو بالکل نمایاں ہوں اور سطح کے نیچے جو کچھ موجود ہوتا ہے ہم اس کے بارے میں کافی حد تک بے خبر رہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی غیر معمولی واقعہ اس دھارے کو متلاطم کرتا ہے تو اس وقت وہ ساری خوبیاں اور خامیاں جو عام حالات میں ہمیں دکھائی نہیں دیتیں وہ ابھر کر بالکل سطح پر آجاتی ہیں اور ہم ان کے بارے میں کافی حد تک صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔

حیات انسانی کا دھارا مختلف طریقوں سے متلاطم ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انفرادی زندگی میں غیر معمولی محبت اور عداوت کے مواقع، بھوک، افلاس، خوف اور اسی نوعیت کے بعض دوسرے مصائب کا پیش آنا، پھر ظفر مندی اور کامرانی کے وقت دماغی توازن کو برقرار رکھنا۔ یہ وہ مختلف مراحل ہیں جو زندگی کی جوئے رواں میں ہل چل پیدا کر کے ان ساری خوبیوں اور خامیوں کو سامنے

لے آتے ہیں جن تک انسانی نگاہ کی عام حالات میں رسائی نہیں ہوتی۔

بالکل اسی طرح جب غیرمعمولی حالات و واقعات کسی قوم کی اجتماعی زندگی کو زیروزبر کرتے ہیں تو اُس وقت اُس کی بھلائی اور بُرائی کے وہ سارے پہلو جو عام طور پر مستور ہوتے ہیں دفعتاً ہوکر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کوئی قوم جنگ کی آگ میں جھونک دی جاتی ہے تو وہ مناسب موقع ہوتا ہے جس میں اس بات کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے مختلف افراد کے اندر فکرونظر کی کتنی ہم آہنگی، احساسات و جذبات کا کس قدر اشتراک، اور سیرت و کردار کا کتنا سرمایہ موجود ہے جس کے بل بوتے پر یہ قوم کسی دوسری قوم کے مقابلے میں صف آرا ہوئی ہے۔

جنگ کے علاوہ کسی ملک میں عام انتخابات بھی ایک ایسی آزمائش ہے جس سے قومی زندگی کا دھارا متلاطم ہوکر قوم کے اُن سارے محاسن اور معائب کو سطح پر لے آتا ہے جو عام حالات میں ہماری حدِ نگاہ سے دور ہوتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں ہمارے ہاں جو عام انتخابات ہوئے ہیں اُنھوں نے ہمیں اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ ہم قوم کے رُجحان، اُس کی سیرت و کردار، اُس کی اُبھرتی ہوئی قیادت، اُس کی اپنے نصب العین سے وابستگی کے متعلق ایک رائے قایم کرسکیں۔ چنانچہ آج ہم اس موضوع پر چند گذارشات پیش کریں گے۔

انتخابات کے مختلف مراحل کا جائزہ لینے اور اُس کے نتائج پر نگاہ ڈالنے سے جو چند حقائق اُبھر کر سامنے آئے ہیں اُن میں سے بعض بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور قوم کے حسّاس اور فرض شناس اصحاب کو گہرے غوروفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان نتائج کی نوعیت کرکٹ کے کھیل کے انجام یا کسی دنگل کے فیصلے سے بہرحال مختلف ہے۔

(یہ انتخاب کوئی تماشہ نہ تھا، جس نے وقتی طور پر اہلِ ملک کے لیے تفریح کا سامان مہیا کیا ہو

بلکہ یہ ایک ایسی آزمائش تھی جس کے ذریعے ہمیں اپنے بہت سے ایسے قومی عوارض کا علم ہو گیا ہے جو پاکستان کی اُمتِ مسلمہ کو اندر ہی اندر سے گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔

ان حقائق میں شاید سب سے زیادہ تلخ اور تکلیف دہ حقیقت پاکستان کے مسلمانوں کی اسلام سے نیم دلانہ وابستگی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک ایسا خطرناک عارضہ ہے جس کے تدارک کی ہر اُس شخص کو فکر کرنی چاہیے جو اپنے دل میں ملک و ملت کی خیر خواہی کا کوئی معمولی سے معمولی جذبہ بھی رکھتا ہے۔

جو حضرات اسلام سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہیں انہیں عام طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اسلام کے محض دعویدار ہیں لیکن اُن کا یہ دعویٰ اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترا۔ اُن کا اسلام سے صرف اسی حد تک تعلق ہے کہ وہ زبان سے ایک خدا کو مانتے اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس ایمان کی جھلک اُن کی زندگی کے کسی گوشے میں دکھائی نہیں دیتی۔ اُن کے مشاغل، اُن کی دوستیوں اور دشمنیوں کے دائرے، اُن کے خوب و ناخوب کے پیمانے، اُن کی کامیابی اور ناکامی کا معیار، الغرض اُن کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جسے دیکھ کر کوئی شخص یہ کہہ سکے کہ یہ گروہ اپنے سیرت و کردار کے اعتبار سے اپنی ایک الگ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق و مالک، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہنما اور اسلام کو نہ صرف اپنا ضابطہ حیات تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کے مطابق کسی حد تک عمل بھی کرتا ہے۔ لیکن اُن کے عمل کی نوعیت دیکھنے سے یہ بات پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اسلام اُن کی زندگی کی اساس اور مبداءِ حیات نہیں۔ وہ اسلام کو اُس حد تک اپناتے ہیں جس حد تک اسلام اُن کے مفادات کے راستے میں مزاحم نہیں ہوتا۔ لیکن جس مرحلہ پر یہ دیکھیں کہ اسلام پر عمل کرنے سے اُن کے کسی مفاد پر زد پڑتی ہے تو اس وقت وہ بڑی بے تکلفی سے اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

[illegible]

اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ پھر دنیا و دین کے تقاضوں میں جب کبھی تصادم بھی ہوتا ہے تو وہ دینی تقاضوں کو ہی فوقیت دیتا ہے اور اپنی دنیاوی مصلحتوں کو ان پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

اگر آپ ان تینوں گروہوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا ان متذکرہ بالا طبقات میں سے صرف تیسرا طبقہ ایسا ہے جس سے پاکستان کی ملتِ اسلامیہ کا مستقبل وابستہ ہے۔ پہلے دونوں گروہ خواہ تعداد کے اعتبار سے کتنے ہی بڑے ہوں لیکن ملک کی تعمیر و ترقی اور اُمتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود میں اُن کا کوئی حصہ نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اجتماعی زندگی کی تشکیل میں وہ کسی جہت سے بھی مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور اُس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصلی قوت ہے جو اقوام و ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد کسی نصب العین کی سچی محبت اور پھر اُس کی راہ میں ہر قسم کے ذاتی نفع و نقصان سے لاپرواہ ہو کر جدوجہد ہی کسی قوم کی زندگی اور اُس کی فلاح و کامرانی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ درحقیقت مقصد سے وابستگی ہی کسی فرد یا قوم کی حیات ہے اور اُس سے بے رغبتی اُس کی موت۔ پھر مقصد ہی سے زندگی میں تربیت و تنظیم پیدا ہوتی اور اُس کے قلب و دماغ میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی تعمیری کام میں لگانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ کسی ایسی قوم کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو مقصد کے عشق سے محروم بھی ہو اور دنیا میں غالب و سربلند بھی۔ سنت اللہ یہی ہے کہ اس دنیا میں جو فرد یا قوم بھی کسی مقصد سے گہری لگن پیدا کر کے اپنی متاعِ حیات اُس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کامیابی تو دوڑ کر آگے بڑھ کر اُن کے قدم چومتی ہے اور عزت و آبرو کا اونچے [illegible] مقام بھی اُن کی زندگی [illegible]

اہلِ پاکستان کے اندر اگر کوئی مقصدِ زندگی کی حرارت اور ولولہ پیدا کرکے انہیں فلاح و کامرانی سے ہم کنار کرسکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ جغرافیائی حدبندیاں ممکن ہے اس کے اندر علیحدگی کا ایک ہلکا سا احساس پیدا کرسکیں لیکن یہ احساس اسے قومیت کا ایک مثبت اور طاقتور شعور عطا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ قومیت منفی اور مثبت دونوں جذبات سے ترکیب پاتی ہے۔ منفی جذبات کسی قوم کو دوسری قوم سے الگ اور اپنے قومی وجود کے تشخص میں مدد دیتے ہیں اور مثبت جذبات اُس کے مائل بہ انتشار اجزا کے درمیان اتفاق و اتحاد پیدا کرکے انہیں ایک قومی وحدت بناتے ہیں اور پھر ان اجزاء کے اندر عمل کی قوت اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا داعیہ پیدا کرتے ہیں۔

پاکستان میں ان دونوں جذبات کی تشکیل میں خاکِ وطن سے کہیں زیادہ اسلام کارفرما ہے۔ ہم کسی ایک جغرافیائی وحدت میں زندہ نہیں جو ہمارے اندر ایک الگ قوم ہونے کا شعور پیدا کرسکے۔ اس ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ ہے۔ اور اُن کے اندر جو لوگ آباد ہیں اُن میں سوائے اسلام کی ایک قدرِ مشترک کے اور کوئی قدرِ اشتراک نہیں۔ اس لئے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی بجائے جغرافیائی حدود اس ملک کے باشندوں کے اندر قومیت کے جذبات پیدا کرسکتی ہیں وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور وہ جتنی جلدی اس غلط فہمی کو دور کردیں اتنا ہی یہ چیز ملک و ملت کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔

جغرافیائی حدود سے آگے بڑھیئے تو پھر قومیت کی ترتیب میں سب سے نمایاں حصّہ قومی روایات کا ہوتا ہے لیکن اس معاملے میں بھی ہماری نگاہیں ہر پھر کر صرف اسلامی روایات تک ہی پہنچتی ہیں۔ اس ملک کے اندر ہمیں اسلامی روایات کے علاوہ اور کوئی ایسی روایات نہیں ملتیں جن کے لیے اس ملک کے باشندوں کے دلوں میں عزت و احترام کا کوئی جذبہ موجود ہو۔ یہاں جب بھی ماضی کا کوئی درخشاں پہلو سامنے آتا ہے تو وہ لازمی طور پر وہی ہوتا ہے جسے اسلام کی درخشندہ اور

تابندہ روایات نے منور کیا ہے۔ ہمارے وہ سارے کارنامے جن کی اساس اسلام کی بجائے غیر اسلامی چیزوں پر ہے وہ خواہ دوسروں کی نظروں میں کتنے ہی اہم ہوں لیکن پاکستان کی اُمتِ مسلمہ اُن پر فخر کرنے کی بجائے اُن پر ہمیشہ ندامت محسوس کرتی ہے۔ چنانچہ دیکھیئے کہ اس ملک میں مسلمان سات سو سال حکمراں رہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے طاقتور اور باجبروت بادشاہ تخت شاہی پر متمکن ہوئے، اُنہوں نے زبردست فتوحات کیں اور سلطنت کی حدود کو وسعت عطا کی، لیکن اس ملک کے رہنے والوں کے دل ہمیشہ انہیں بوریہ نشینوں کی عزت واحترام سے معمور رہے جنہوں نے سلطنتوں کو سرنگوں کرنے کی بجائے لوگوں کے دلوں کو اسلام کے لیے مسخر کیا۔ تخت وتاج، لشکرو سپاہ، فتح مندیاں اور کامرانیاں ایک مسلمان کے لیے اُسی صورت میں کچھ اہمیت رکھتی ہیں جب ان کے حصول کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہو۔ لیکن جب یہ مقصد نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ تو پھر ایک مسلمان کی نظر میں ان کی حیثیت پرِ کاہ سے بھی کم ہے۔

قومی روایات کے علاوہ زبان، رنگ اور نسل کسی خطہ کے لوگوں کے درمیان وجہ اشتراک بن سکتی ہے۔ لیکن پاکستان میں ان تینوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس سے ہم پاکستانی قومیت کی تشکیل میں فائدہ اُٹھا سکیں۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں جو لوگ آباد ہیں وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ رنگ کے اعتبار سے اُن میں اختلاف پایا جاتا ہے اور پھر اُن کا تعلق مختلف نسلوں سے ہے۔ ایک سرحدی اور بنگالی، سندھی اور پنجابی، کشمیری اور بلوچی کے درمیان زبان، رنگ اور نسل کے معاملے میں کوئی اشتراک دکھائی نہیں دیتا۔

کچھ عرصہ سے بعض سرپھروں کی طرف سے کہیں کہیں یہ آواز بھی کانوں میں آ رہی ہے کہ میلے ٹھیلے، ناچ، گانے اور اسی طرح کی بعض دوسری اخلاق سوز دلچسپیاں جنہیں بڑی چالاکی اور عیاری سے ثقافت کا نام دے دیا گیا ہے، قومیت کی تعمیر میں ممد ومعاون ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ محض فریب نظر ہے

اور اس طرز پر سوچنے والوں کے ذہنی افلاس اور فکری کجی پر دلالت کرتا ہے۔

ان سرگرمیوں کا مقصد لوگوں کو محض تفریح کا سامان مہیا کرنا ہے۔ ان کے ذریعے آج تک کسی قوم نے اپنے اندر فکر و عمل کی وحدت پیدا نہیں کی۔ یہ سرگرمیاں درحقیقت کسی قوم کے اعلیٰ اور ارفع احساسات کی ترجمان نہیں ہوتیں بلکہ اس کے ناتراشیدہ اور غیر تربیت یافتہ جذبات کا مظہر ہوتی ہیں۔ ان سرگرمیوں میں عقلی عناصر یکسر ناپید ہوتے ہیں اور عارضی ہیجان لوگوں کے اندر ایک غلط قسم کی تحریک پیدا کر کے انہیں وقتی طور پر دنیا کے تلخ حقائق سے غافل کر دیتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ محض "ترنگ" کسی قوم کے حفظ و بقا اور اس کی ترقی کی اساس نہیں بن سکتی۔ قوم کی زندگی اور اس کی فلاح و کامرانی میں عقل و شعور، جذبہ و احساس یہ سب عناصر مل کر کام کرتے ہیں تب کہیں جا کر قوم کے مختلف اجزا کے درمیان ایک رابطہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک نصب العین کے حصول کے لیے اپنے آپ کو سرگرم عمل پاتی ہے۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اہل یونان کے اندر ان تفریحی دلچسپیوں نے قومیت کا شعور پیدا کیا اور ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگایا، وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان کا یہ دعوےٰ تاریخ کے نہایت سطحی اور ناقص مطالعہ پر مبنی ہے۔ اہل یونان نے خاک وطن سے اپنی قومیت کا خمیر اٹھایا تھا۔ باقی رہیں یہ دلچسپیاں تو یہ اگرچہ ان کی زندگی کا اہم جزو بن چکی تھیں لیکن افراد کے اندر فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنے میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ انہوں نے زندگی میں جو مادہ پرستانہ انداز فکر اختیار کر رکھا تھا یہ دلچسپیاں ایک خاص دائرے میں اس کا مظہر تھیں۔

قومیت کی تشکیل میں وہی عناصر سب سے زیادہ مؤثر اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں جن کے لیے لوگوں کے دلوں میں عزت و احترام کے جذبات موجود ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کسی ایسی چیز پر مرمٹنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جس کے لیے اس کے دل میں عقیدت کا جذبہ نہ پایا جاتا ہو۔ ممکن ہے کہ طویل محنت اور زبردست جدوجہد کے بعد پاکستان کے ارباب سیاست وکشاد

رقص و سرود کو اس ملک میں فروغ دینے میں کسی حد تک کامیاب ہو جائیں لیکن یہ سوچنا کہ یہ اخلاق سوز سرگرمیاں اس ملک کے رہنے والوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز بھی بن سکتی ہیں ایک خوفناک مغالطہ ہے۔ ان کے ذریعے لوگوں کے اخلاق تباہ کیے جا سکتے ہیں، اُن کے اندر فکر و احساس کا انتشار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ لوگوں کے دل ان سرگرمیوں کی عقیدت میں جھک جائیں اور وہ ان کی محبت میں جان کی بازی لگانے پر تیار ہو جائیں۔

اس خطۂ پاک میں یہ سرگرمیاں تخریبی کام تو کر سکتی ہیں لیکن تعمیر و ترقی کی راہ میں ان سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اُس سے یہ بات پوری طرح منکشف ہو گئی ہو گی کہ جغرافیائی حد بندیاں، رنگ و نسل کا امتیاز، زبان کا اختلاف یا ثقافتی سرگرمیاں ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ہماری قومیت کی تشکیل میں ہمیں اساس کا کام دے سکے۔ ہمارے ہاں صرف اسلام ہی ایک ایسی قوت ہے جو ہمارے اندر فکری اور عملی وحدت پیدا کر کے ہمیں ایک ملت بنا سکتی ہے۔ اس ایک بنیاد کے علاوہ اور جتنی بنیادیں بھی تلاش کی جائیں گی وہ بالکل کمزور اور ناکارہ ہوں گی اور اس معاملے میں ہمارے سارے تجربات یکسر ناکام ثابت ہوں گے۔ اور ان تجربات میں جو وقت، محنت اور سرمایہ صرف ہو گا وہ بالکل رائگاں جائے گا۔ اہلِ پاکستان اس حقیقت کو جتنی جلدی ذہن نشین کر لیں یہ چیز اُن کے لیے اتنی ہی خیر و برکت کا موجب ہو گی۔ اسلام اس ملک کی عظیم اکثریت کی نہ صرف توجہ اور عقیدت کا مرکز ہے، بلکہ وہ یہاں کی ایک زبردست تاریخی قوت بھی ہے۔ اسی ایک بنیاد پر یہ ملک قایم ہوا۔ اور اسی کی محبت میں اس برِاعظم کے مسلمانوں نے وہ بیش بہا قربانیاں دیں جن کی تاریخِ عالم میں نظیر بہت کم ملتی ہے۔

جس قوت پر کسی قوم کی زندگی کا پورا دارومدار ہو اُس قوت کے بارے میں کوئی ہوشمند

قوم وہ غیر ذمہ دارانہ رویّہ اختیار نہیں کر سکتی جو پاکستان کے مسلمانوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اور جس کا بیّن ثبوت ہمیں موجودہ انتخابات کے نتائج سے ملتا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس انتخاب میں کون لوگ کامیاب ہوئے اور کون ناکام، ہمارے لیے جو چیز اصل اہمیّت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ قوم کے چیدہ اور منتخب افراد جن کے متعلق یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ وہ اس ملّت کا جوہرِ قابل ہیں، انھوں نے اس فیصلہ کُن مرحلہ میں اسلام سے کس قدر وفاداری کا ثبوت دیا۔ اور اسی ایک چیز کی طرف ہم پورے ملک کے حسّاس اور فرض شناس لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اسلام کی حیثیت ہمارے لیے کسی کھیل تماشہ کی نہیں کہ اس سے جس طرح کا تعلق خاطر ہم چاہیں قایم کرتے رہیں۔ یہ ہمیں رگِ جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ یہ ہماری طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اسی کی مقناطیسی کشش نے ہماری ملّت کے مختلف اجزا کو باہم جوڑ رکھا ہے، اسی سے ہمارے اندر عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جب زندگی کی اس سرحد کو عبور کر کے ایک بڑی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو اس وقت ہمیں ثواب یا عذاب کی شکل میں جو کچھ ملتا ہے وہ اسی تعلق کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہماری دنیوی زندگی کی کامیابی اور آخروی فلاح و کامرانی صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ جو چیز ہمارے لیے اتنی زیادہ اہمیّت رکھتی ہو اس کے بارے میں ہمارا یہ طرزِ عمل کہ ہم اُسے برادری کے نام پر، زر و مال کے لالچ میں آکر ناجائز معادات کی محبت میں گرفتار ہو کر بلا تکلف قربان کر دیں ملّت کے مستقبل کے لیے کوئی فال نیک نہیں ہو سکتی۔

انسان جس چیز کو اپنا مقصد و مدعا بناتا ہے، جسے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیتا ہے اُس کے متعلق یہ نیم دلانہ، بالکل منافقانہ رویہ کبھی اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے جو ہم نے اسلام کے معاملہ میں اختیار کر رکھا ہے۔ اور جس کا اظہار ان انتخابات میں ہم نے کیا ہے۔ ہم نے اپنے عمل سے

یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے اندر کوئی حمیت دینی نہیں، ہم اپنی کوئی مستقل اور پائیدار رائے نہیں رکھتے، ہماری محبت اور عقیدت کا کوئی محور نہیں اور ہمارے قول و قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسلام سے خواہ ہم کتنی عقیدت کا اظہار کرتے رہیں لیکن ہماری محبت کا اصل مرکز ہمارے دُنیاوی مفادات ہیں، ہماری برادریاں ہیں، ہماری چودھراہٹیں اور دھڑے بندیاں ہیں، ہماری ذاتی خواہشات اور تمنائیں ہیں۔ ہم اسلام کو ان پر قربان کر سکتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی اسلام کی راہ میں قربان کرنے پر تیار نہیں۔

اسلام کے معاملے میں ہماری یہ مضحکہ خیز روش ہماری دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر دے گی۔ اسلام اپنے ہر ماننے والے سے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اُس کا سب سے پہلا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنی جملہ خود مختاریوں سے دست بردار ہو جائیں اور صرف خدائے واحد کی غلامی کا جُوا اپنی گردن میں پہن لیں۔ ایک مسلمان کی یہی غایت الغایات ہے اور اسی ایک محور پر اُس کے مفادات، اُس کی دلچسپیاں گھومتی ہیں۔

یہی وہ ایک چوکھٹ ہے جس پر وہ اپنی قیمتی سے قیمتی متاعِ حیات قُربان کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ یہ آمادگی ہی اُس کے ایمان کی سب سے بڑی علامت ہے۔ ایمان درحقیقت ایک خاص اندازِ فکر کا نام ہے جو انسان کے قلب و دماغ میں کائنات اور اُس کی مختلف اشیاء کے متعلق اقدار کا ایک خاص نظام قایم کرتا ہے۔ ایک مسلمان اسلام لا کر دُنیا سے منہ موڑ نہیں لیتا ہے بلکہ وہ اسلام کے مطابق اُن کی قدر و قیمت متعیّن کرتا ہے۔ ایمان کوئی مرغِ بادنما نہیں جس کے رُخ کو ذاتی مفادات اور خواہشات کے تھپیڑے ہر وقت تبدیل کرتے رہیں۔ یہ ایک کسوٹی ہے جس کی مدد سے کھرے اور کھوٹے کے درمیان تمیز کی جاتی ہے، یہ ایک معتدل میزان ہے جس میں ہمارے اعمال کا وزن کیا جاتا ہے، یہ ایک روشنی کا مینار ہے جو زندگی کی تاریکیوں میں سے گزرتے ہوئے انسان کے لیے رشد و ہدایت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں دین کے معاملے میں یکسوئی

اختیار کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے :

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔	اے ایمان والو تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ، اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی اسلام کے تابع کر لو۔ تمہارے افکار و نظریات، تمہارے جذبات و احساسات، سب اسلام کے تحت آجائیں۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ اس نے مومنوں سے اُن کی جانوں اور مالوں کا سودا کر لیا ہے :

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔	حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے اُن کے جان و مال کے جنت کے عوض خرید کر لیے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے، مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے۔ تورات، انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے۔

قرآن پاک نے یہاں اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ ایک مومن جنت کے بدلے اپنی ہر چیز خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور وہ جس لمحہ ایمان لے آتا ہے اُسی وقت اُس سے یہ اختیار سلب کر لیا جاتا ہے کہ وہ نفس کی کسی تحریک سے یا خارجی دباؤ سے اللہ کی منشا اور مرضی کے برخلاف اپنی جان اور اپنے مال میں تصرّف کر سکے۔ ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان اپنی قوتوں اور اپنی صلاحیتوں کا، اپنے مال و متاع کا، اپنی جان اور عزّت و آبرو کا مالک و مختار نہیں رہتا بلکہ وہ ان کا امین قرار پاتا ہے اور امین کے لیے یہ بات انتہائی غیر مناسب بالکل اخلاق سے گری ہوئی ہے کہ وہ امانتیں

خیانت جیسے فعل کا ارتکاب کرے۔

ہم اس ملک کے "جوہر قابل" سے یہ نہیں پوچھتے کہ اُس نے انتخاب کے وقت کن کن حضرات کے حق میں ووٹ دیئے۔ افراد ہماری بحث سے یکسر خارج ہیں لیکن ہم اُن سے یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ وہ خدا را خود اپنے آپ سے دریافت کریں کہ کیا اُنہوں نے اپنی رائے دیتے وقت اُس عہد کو پورا کیا ہے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے اُنہوں نے اپنے خالق و مالک سے باندھا ہے۔ کیا اُن کا ضمیر اس بات پر مطمئن ہے کہ اُنہوں نے اس فیصلہ کُن مرحلہ میں خدا کی رضا کو اپنی ذاتی خواہشات، برادری کے مطالبات اور زر و مال کی تحریصات پر مقدّم رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ انہیں اسلام دُنیا کی ہر چیز سے عزیز تر ہے۔ کسی مقصد سے وابستگی کی یہ بالکل ایک انوکھی قسم ہے کہ انسان اُس سے عقیدت کا اظہار بھی کیے، اور اُسے دُنیا کی ہر شے سے محبوب تر بھی سمجھے، لیکن جب بھی آزمائش کا موقع آئے تو وہ اس متاعِ گراں مایہ کو یکسر نظر انداز کر کے ان چیزوں کو ترجیح دینے پر تیار ہو جائے جنہیں وہ زندگی کے ادنےٰ مقاصد سمجھتا ہے۔

خدا کو کسی نے دیکھا نہیں۔ انسان اُسے اُس کی نشانیوں سے ہی پہچانتا ہے۔ یہی حال ایمان کا ہے ایمان درحقیقت ایک داخلی کیفیت کا نام ہے اور اُسے واقعی کسی میزان پر تولا نہیں جا سکتا ہے اس کے لیے کوئی پیمانہ بھی نہیں جس کے مطابق اس کی پیمائش کی جا سکے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے اظہار کا کوئی ذریعہ ہی نہ ہو۔ یہ داخلی کیفیت انسان کے سیرت و کردار اُس کے اخلاق میں لازمی طور پر منعکس ہوتی ہے۔ وہ ایمان جو انسان کے افکار و نظریات اُس کے افعال و اعمال، اُس کے پسند و ناپسند کے معیار اور اُس کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتا وہ ایمان بلاشبہ بغیر دلیل کے دعوےٰ ہے۔ اس ایمان کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح اندازہ تو خداوند تعالےٰ خود ہی قیامت کے روز کرے گا کیونکہ ایمان جیسی لطیف شے کے وزن کرنے کے لیے اس دنیا میں کوئی ترازو نہیں لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جو ایمان ایک مسلمان کو خداوند تعالےٰ کا تابع فرمان بننے کی

ترغیب نہیں دیتا اُس ایمان میں یقیناً کوئی سُقم موجود ہے۔

آپ شاید یہ سمجھ رہے ہوں کہ آپ نے ووٹ دے کر جو فیصلہ کرنا تھا وہ ہنگامی طور پر کر دیا اور اس کے نتائج کی کوئی ذمہ واری آپ پر عاید نہیں ہوتی لیکن یہ محض فریبِ نفس ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے آپ اُس میں برابر کے شریک ہیں۔ جو نمایندے آپ کی تائید سے منتخب ہوئے ہیں اُن کی سرگرمیوں کے اچھے اور بُرے پہلو آپ کے نامۂ اعمال میں بھی درج ہوتے رہیں گے۔ اگر وہ اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کریں گے تو اس سے آپ کی نیکیوں میں اضافہ ہوگا اور اگر وہ اس سرزمین میں منکرات کو پھیلانے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں گے تو ان کی یہ بُرائیاں آپ کے حساب میں بھی برابر درج ہوتی رہیں گی۔ حضورؐ کے احساسات اس معاملے میں کس قدر نازک تھے اُس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے:

من مشیٰ مع ظالم وھو یعلم أنہ ظالم لیقویہ فقد خرج من الاسلام۔	جو کسی ظالم کے ساتھ اس نیت سے چلا کہ اُسے تقویت دی جائے اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے تو وہ گویا دائرہ اسلام سے خارج ہوا۔

ایک اور مقام پر اسی چیز کی اہمیّت دوسرے الفاظ میں اس طرح واضح فرمائی:

من وقّر صاحب بدعۃ فقد ھدم الاسلام۔	جس نے کسی صاحب بدعت کی عزت و توقیر کی اُس نے گویا اسلام کی عمارت منہدم کر دی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمودات اس حقیقت کی طرف کھُلے الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں کہ ہمیں ذاتی دلچسپیوں اور مفادات سے بلند ہو کر صرف اسلام کے تقاضوں کے پیش نظر لوگوں کی حمایت اور عزت و توقیر کرنی چاہیے۔ اگر ہماری غیر ذمہ دارانہ روش سے کسی ظالم اور فاسق یا دین کے اندر رخنے پیدا کرنے والے کو اُمتِ مسلمہ میں سربراہی کا منصب حاصل ہو گیا تو وہ لوگوں پر ظلم ڈھانے، فسق و فجور پھیلانے اور دین کے اندر نئی نئی باتیں داخل کرنے کے لیے جو جدوجہد بھی

کرے گا یا جس قسم کے مکر و فریب سے کام لے گا تو اس کے انجام بد سے خواہ ہم اس دُنیا میں دوچار ہوں یا آخرت میں، ہم بہر حال دوچار ضرور ہوں گے۔

پھر آپ اس معاملہ پر خالص دُنیاوی نقطہ نظر سے بھی اگر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کے معاملے میں ہمارا یہ غیر سنجیدہ طرزِ عمل ہمیں دُنیا میں بھی ذلیل و رُسوا کرنے کا موجب ہوگا۔ دنیا کی ہر ہوشمند قوم جس چیز کو اپنا مقصدِ حیات یا نصب العین قرار دیتی ہے اُسے وہ کائنات کی سب چیزوں سے عزیز ترین سمجھتی ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اس کی بارگاہ میں اپنا مال و جان بلا دریغ پیش کرتی ہے۔ اُس کا یہی ایثار اور اپنے مقصد سے گہرا لگاؤ اور عشق اُس کے اندر قوت و طاقت پیدا کرتا ہے اور اس کے افراد کو نفسانیت اور خود غرضی جیسی مہلک بیماریوں سے نجات دلا کر انہیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ قوم اور ملک کی خاطر کسی تحریص و طمع کے بغیر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جس قوم کے منتخب افراد بھی روپے، پیسے کے لالچ میں اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اُن کے بارے میں یہ سوچنا کچھ مشکل نہیں کہ وہ اسی زر و مال کی چوکھٹ پر اپنے قومی اور ملکی مفادات بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کریں گے جو انسان اپنے ایمان کو منڈی کی شے بنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور بے جان سکوّں کے عوض اُسے بیچ دیتا ہے اُس سے یہ چیز غیر متوقع نہیں کہ کل وہ اپنے ملک اور قوم کا بھی غیروں کے ہاتھ سودا کرلے۔

ان انتخابات میں دوسری چیز جو ہمارے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ملک اگرچہ بڑی سُرعت کے ساتھ مادہ پرستی کی طرف جا رہا ہے لیکن اس میں ابھی تک نیکی، پرہیزگاری یکسر ناپید نہیں ہوئی ہے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی ہمیں اخلاص، دلسوزی، ایثار، خشیت اللہ اور پاسِ عہد کی ایسی روشن مثالیں ملتی ہیں جنہیں دیکھ کر ارادوں میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور انسان کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جس قوم میں اس مضبوط سیرت و کردار کے لوگ موجود ہوں

خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی تھوڑے ہوں لیکن کبھی جاہلیت ایک غالب و حکمران قوت بن سکتی ہے۔

اس ملک میں پاک باز لوگوں کا وجود اہلِ ملک اور اس خطہ پاک کے لیے یقیناً ایک بہت بڑی سعادت ہے۔ شاید اسی مقدس گروہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہماری نافرمانیوں کے باوجود ہمیں کسی عذاب میں مبتلا نہیں کر رہا۔ لیکن یہاں جو نیکی اور پرہیزگاری موجود ہے اُس کا زیادہ حصہ ابھی تک گوشۂ عافیت میں خاموش پڑا ہے یہ نیکی بلاشبہ اس گوشہ میں بھی ایک مقدس فرض انجام دے رہی ہے۔ لیکن جاہلیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ نیکی ایک منظم قوت کی صورت میں غیر اسلامی طاقتوں کے خلاف صف آرا ہو۔ یہ مرحلہ اجتماعی جدوجہد کا ہے اور اس میں حق اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب حق کے علمبردار اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کا پوری طرح احساس کریں اور باہم متحد ہو کر جاہلیت کی یلغار کا راستہ روکنے کی کوشش کریں۔

تیسرے ان انتخابات نے اس حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ اس ملک کے عوام میں اسلام کی محبت اور تڑپ ہو تو ہو لیکن یہاں جن لوگوں کی چودھراہٹیں قائم ہیں، یا جنہیں اپنے اپنے حلقے میں سربراہی کا منصب حاصل ہے یا جو لوگ اپنے اپنے دائرے میں کچھ اثر و رسوخ رکھتے ہیں، اُن کی عظیم اکثریت یا تو اسلام کے تقاضوں کو نہیں سمجھتی یا پھر اسلامی احساسات سے یکسر عاری ہے۔ اسے اسلام سے کہیں زیادہ اپنی قیادت اور اپنے دنیاوی مفادات عزیز ہیں۔ اس بنا پر یہ چیز انتہائی ضروری ہے کہ سب سے پہلے مقامی قیادت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کمزور، بودی اور ناکارہ بنیاد پر جسے مفادات ہر لحظہ متزلزل کر سکیں، اسلامی نظامِ حیات کی کبھی بھی پائیدار عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔

آخر میں ہم ایک گذارش اُن حضرات کی خدمت میں بھی کرنا چاہتے ہیں جو اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا داعیہ لے کر اُٹھے ہیں۔ ان انتخابات سے انہیں اس حقیقت کا پوری طرح اندازہ ہو گیا ہو گا کہ انہیں کس سنگلاخ زمین میں کام کرنا ہے اور اس کے لیے کس عزم، صبر اور دانش مندی کی ضرورت ہے۔ اُن کی راہ میں کون سے موانع اور مشکلات حائل ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے انہیں کتنی محنت درکار ہے۔ براہِ کرم اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھیے کہ اہلِ ملک کا انفرادی اور اجتماعی کردار جو اسلامی نظام کے لیے بُنیادی اہمیت کا حامل ہے، بڑی سرعت کے ساتھ تنزّل کی طرف جا رہا ہے۔ یہاں مادہ پرستی حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اپنے گھناؤنے پر پھیلا رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اکاس بیل کی طرح زندگی کے سارے شعبوں پر چھیا تا چلا جا رہا ہے۔ اور اس وجہ سے انسان بس ایک کمانے والا جانور بن کر رہ گیا ہے۔ زندگی کی مادی لذتوں نے اُس کے قلب و دماغ کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے کہ اُس کے اندر کسی اعلیٰ اور ارفع قدر کی عزّت و توقیر باقی نہیں رہی۔ مادی منفعت فکر و عمل کا سب سے بڑا محرک بن کر رہ گئی ہے۔ اور انسان کی پوری زندگی اسی ایک محور پر گھوم رہی ہے۔

اس ملک کی اُبھرتی ہوئی قیادت کو عوام کی اس کمزوری کا پوری طرح علم ہو چکا ہے، اور وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جان چکی ہے کہ یہاں کے رہنے والے خواہ اسلام سے کتنی وابستگی ظاہر کریں لیکن اُن کی عملی تائید انہیں لوگوں کو حاصل ہو گی جو ان کی جیبیں گرم کر سکیں، یا حکام سے انہیں ناجائز مراعات دلا سکیں یا اُن کے لیے عیش و عشرت کا سامان فراہم کرنے کا اراده اور قوت رکھتے ہوں۔ فکر و احساس کی یہ تبدیلی ملک و ملّت کے لیے انتہائی مہلک ہے اور دین پسند عناصر جہاں جاہلیت کی دوسری قوتوں سے نبرد آزما ہیں وہاں انہیں اس خطرناک رجحان کو بھی تبدیل کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر یہ وبا پوری طرح پھیل گئی تو اس سے ملک و ملّت کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ جو شخص اپنے ضمیر کے سودے پر آمادہ ہو جائے اُس سے یہ بعید نہیں کہ وہ مفادات کے لالچ میں پوری ملّت کا سودا کر ڈالے۔ یہ رجحان کوئی

وقتی اور ہنگامی چیز نہیں جس سے صرفِ نظر کیا جا سکے، یہ ایک عارضہ ہے جو اندر ہی اندر سے ملک و ملّت کو کمزور کر رہا ہے۔ اس کی جڑیں بڑی گہری ہیں اور انہیں بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے شدید محنت کی ضرورت ہے۔

حالات بلاشبہ حوصلہ شکن ہیں، لیکن آپ حضرات کو ان سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ جہاں تاریکی زیادہ ہو وہاں روشنی کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس کی جاتی ہے پھر آپ نے تو ایک ایسی وادی میں قدم رکھا ہے جہاں کامیابی اور ناکامی کا معیار بالکل دوسرا ہے۔ آپ کی جد و جہد کی کامیابی کا انحصار کسی خارجی نتیجہ پر نہیں بلکہ ایک داخلی کیفیت پر ہے۔ اگر آپ نے ایک کام خالص اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے تو خواہ مادی دنیا میں اُس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا آپ بہرحال کامیاب ہیں۔ اور اس کے برعکس اگر اپنے عزائم میں قدم قدم پہ کامیاب ہوں، لیکن آپ کے دل میں خدا کی رضاجوئی کا جذبہ صادق موجود نہ ہو تو یہ آپ کی سخت ناکامی ہے۔ اس بنا پر آپ کو اپنے عمل کے نتائج مادی دنیا میں تلاش نہ کرنے چاہئیں بلکہ انہیں دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔)

فرماں روائے مملکت سعودیہ عربیہ سعود بن عبدالعزیز نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مدینہ یونیورسٹی کی مشاورتی کمیٹی کا رکن نامزد کیا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ مولانا موصوف ایسے وقت میں تشریف لائیں کہ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کر سکیں اور اس کے بعد ۲۰ رذی الحجہ کو یونیورسٹی کے افتتاح میں بھی شرکت فرما سکیں۔ چنانچہ حضرت مولانا اس دعوت پر وہاں تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے ساتھ آپ کے رفیق کار مولانا خلیل حامدی بھی ہیں۔

حضرت مولانا کی غیر حاضری کی وجہ سے اس مرتبہ تفہیم القرآن تیار نہیں ہو سکی اور

یہ پرچہ اس کے بغیر ہی قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اگلے ماہ اس کا سلسلہ انشاءاللہ باقاعدہ شروع کردیا جائے گا۔

یہ سطور ابھی سپردِ قلم کی جارہی تھیں کہ ہمارے ایک محترم رفیق کارنے ہماری توجہ اُس مکالمہ کی طرف مبذول کرائی جو عید کے دوسرے روز لاہور ریڈیو سٹیشن سے جمہور کی آواز کے تحت نشر ہُوا۔ اس میں سنتِ ابراہیمی کا جس افسوسناک طریق سے مذاق اُڑانے کی کوشش کی گئی ہے وہ ہر لحاظ سے شرمناک ہے۔ پاکستان کی نشرگاہیں یوں بھی دین و ملت کی کوئی تعمیری خدمت سرانجام نہیں دے رہیں، اُن کے پروگراموں کا زیادہ حصّہ فلمی گانوں اور اسی طرز کے گھٹیا اور اخلاق سوز کاموں کی نذر ہورہا ہے۔ اور ان سے اہلِ ملک خصوصًا نوجوان طبقہ جس بُری طرح سے متاثر ہُوا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ لیکن کچھ عرصہ سے ہم یہ برابر محسوس کررہے ہیں کہ نشریات کا شعبہ جن اصحاب کے ہاتھ میں ہے وہ ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت لوگوں کے دلوں میں اسلامی تعلیمات اور اُس کے شعائر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کررہے ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں ہی میں مخدومی چوہدری غلام محمد صاحب نے کراچی ریڈیو سٹیشن کی "قرآنی خدمات" کی نقاب کشائی فرمائی۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کیا یہ سب کچھ حکومت کے ایماء پر ہورہا ہے یا اس محکمہ کے چند "من چلے" یہ سب کچھ اپنے "اجتہاد" کے تحت ہی کررہے ہیں۔ اگر یہ حکومت کے اشاروں پر کیا جارہا ہے تو حکومت کو اپنے اس منصوبے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے۔ پاکستان میں شعائر اسلامی کی توہین و تضحیک اربابِ حکومت کے لیے کسی طرح بھی سود مند ثابت نہ ہوگی۔ اور اگر کچھ سر پھرے حکومت کے منشا اور مرضی کے بغیر یہ کررہے ہیں تو حکومت کو اُن کا سختی سے نوٹس لینا چاہیئے۔

دین میں سنّتِ رسولؐ کی اہمیّت

از

حافظ ابنِ قیمؒ

ترجمہ عبدالحمید صدیقی

یہ مضمون حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ کی شہرہ آفاق تصنیف "اعلام الموقعین" کے جزءِ اوّل کا ترجمہ ہے۔ مضمون کا ابتدائی حصّہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

(مترجم)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (النساء۔ ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

اس آیت میں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ اطیعوا کا لفظ جس طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے حق میں ارشاد فرمایا ہے بالکل اسی طرح اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کا حضور سرورِ کائنات کے لیے الگ استعمال کرنا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ حضور سرورِ دو عالم کی اطاعت مستقل اور غیر مشروط ہے۔ اس اعتبار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم واجب التعمیل ہے۔ خواہ وہ قرآن مجید میں موجود ہو یا نہ۔ کیونکہ خداوند تعالےٰ نے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اللہ سے نوازا ہے بالکل اسی طرح انہیں اُس جیسی ایک اور چیز بھی عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولی الامر

کے لیے اطیعوا کا الگ لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ اسے یہاں حذف کر دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اولی الامر کی اطاعت مستقل اور غیر مشروط نہیں بلکہ اطاعتِ رسول کے تابع ہے۔ لوگ اگر اولی الامر کی اطاعت کرنے کے پابند ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ خود لوگوں سے اپنی اطاعت کا تقاضا کر سکتے ہیں بلکہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اُن کی اطاعت چونکہ حضور کی اطاعت کے تابع ہوتی ہے اس لیے وہ درحقیقت حضور کی اطاعت ہی ہوتی ہے۔ صاحبِ امر جو حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں دیں اُس کی پابندی ضروری ہے۔ اور جو حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے آزاد ہو کر، یا اُس کے خلاف دیا جائے اُس میں نہ سمع ہے نہ اطاعت۔"

حضور سرورِ دو عالم نے اس سلسلہ میں خود ارشاد فرمایا ہے:

لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق۔ — کسی مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں نہیں۔

پھر اسی سلسلہ میں یہ اصول بھی بیان فرما دیا:

انما الطاعۃ فی المعروف — اطاعت صرف معروف ہی میں ہے

اولی الامر کے بارے میں اس امر کی تصریح بھی فرما دی:

مَن امرکم منھم بمعصیۃ اللہ فلاسمع لہٗ ولاطاعۃ۔ — ان میں سے جو بھی تمہیں اللہ کی نافرمانی کا حکم دے، اُس کے لیے نہ سمع ہے نہ اطاعت۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب ان جانثاروں کا ذکر کیا گیا جنہوں نے امیر کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے اپنے آپ کو شعلوں کی نذر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ لوگ آگ میں کود پڑتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے اور وہاں سے ان کے نکلنے کی کوئی صورت نہ پیدا ہوتی۔ درآنحالیکہ اُن کا آگ میں کودنا امیر کے حکم کے عین مطابق تھا[ل] اور اس حکم کی

[ل] حافظ ابن قیم رح نے اس واقعہ کی تفصیل اپنی دوسری تصنیف زاد المعاد میں دو مختلف مقامات پر بیان کی ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ یہ آیت — یا ایھا الذین امنوا۔۔۔

تعمیل وہ اپنے لیے دینی اعتبار سے نہایت ضروری قرار دیتے تھے۔ حضور سرور دو عالم نے جوان کو یہ وعید سنائی تھی کہ وہ اگر ایک مرتبہ آگ کے اندر گھس جاتے تو پھر اُس سے انہیں نجات نہ ملتی تو اس کی وجہ یہ ہے اُنہوں نے امیر کے اس حکم کے سارے مضمرات کو احکام الٰہی کی روشنی میں پرکھنے کی پوری طرح کوشش نہ کی اور اولی الامر کے کہنے پر اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور اطاعت کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیا کہ اُس میں وہ چیز بھی آگئی جو شارع علیہ السلام کی منشا اور مرضی کے یکسر منافی تھی بلکہ جس کے خلاف حضور سرور دو عالم کے صریح احکام موجود تھے۔ اُنہوں نے ان احکام کو معلوم کرنے کی پوری طرح سعی نہ کی۔ اور بغیر کسی بیّن اور واضح دلیل کے اپنے آپ کو عذاب میں ڈالنے پر آمادہ کر لیا۔ جب اتنی معمولی سی غلطی، جس میں نہ تو نیّت کا فتور ہے اور نہ ارادہ کی خرابی بلکہ جس کے پیچھے اطاعت امر کا ایک نہایت نیک جذبہ کار فرما ہے، انسان کو جہنّمی بنا سکتی ہے تو پھر ان لوگوں کے انجام کا تصور کیجیے جو اللہ اور اُس کے رسول ص کے احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے مؤمنوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اپنے ہر اُس معاملے کو جس میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے یا نزع کی کوئی صورت نکل آئے اللہ اور اُس کے رسُول کی طرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹) عبداللہ بن حُذافۃ السّہمی کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔ حضور سرور کائنات نے انہیں انصار کے ایک گروہ پر امیر مقرر کر کے ایک مہم پر روانہ کیا۔ چلتے ہوئے مجاہدین سے فرمایا: کہ تم اس کی تابعداری کرنا۔ لشکریوں نے عبداللہ بن حذافہ کو کسی بات پر ناراض کر دیا اور اُنھوں نے انہیں لکڑیاں جمع کرنے اور آگ جلانے کا حکم دیا۔ پھر کہا کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا تھا۔ اُنہوں نے کہا "ہاں" حضور نے واقعی ہمیں اس امر کی تاکید فرمائی تھی۔ اس پر عبداللہ نے کہا کہ تم آگ میں کود جاؤ۔ یہ حکم سُن کر سب متحیّر ہوئے اور ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر کہنے لگے "آگ کے خوف سے بھاگ کر تو ہم نے حضور سرور دو عالم کے دامن میں پناہ لی ہے"۔ یہ بات سُن کر حضرت عبداللہؓ کا غصّہ ٹھنڈا ہوا۔ جب یہ ماجرا حضور ص کو سُنایا گیا تو آپ نے یہ الفاظ فرمائے: اگر یہ لوگ اس آگ میں داخل ہو جاتے تو پھر وہاں سے نکل نہ سکتے۔ اطاعت تو صرف معروف ہی میں ہے۔

لوٹادیں۔ اسی میں اُن کی دنیوی فلاح اور اُخروی نجات کا راز مضمر ہے۔ یہ آیت فکر وعمل کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے۔

(۱) اہلِ ایمان کے مابین بھی اختلاف کی راہیں نکل سکتی ہیں لیکن یہ اختلاف اُنہیں دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

(۲) صحابہ کرامؓ تمام اُمت میں سب سے زیادہ ارفع واعلیٰ ہیں اور ایمان کی پختگی میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اس رفعت اور عظمت کے باوجود اُن میں بھی کبھی کبھی مقام مّن وتو آہی جاتے تھے۔ لیکن اُن کا یہ اختلاف جزئیات اور فروعات ہی میں تھا۔ وہ دین کے اساسی معاملات میں سب متفق تھے۔ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور افعال کے بارے میں وہی باتیں کہتے جن کی تائید قرآن وسنت کرتے ہیں۔ جن امور کی اللہ اور اُس کے رسول نے تصریح فرمادی ہے وہ ان میں کسی امر کی تاویل کو گوارا نہ کرتے، انہیں الفاظ کا اُلٹ پھیر کرکے، یا انہیں موقع ومحل سے الگ کرکے اپنی ذہنی اپج کے مطابق نئے نئے معانی پہنانے کی بھی عادت نہ تھی۔ اُن کی سعید روحیں اس بات کو کبھی گوارا نہ کرتی تھیں کہ ہر حقیقت کو اپنی منشا اور مرضی کے مطابق مجاز کا رنگ دے کر اپنے دل پسند نظریہ کے مطابق موڑ لیا جائے۔ اُنہوں نے اُن سارے حقائق کو جو انہیں قرآن وسنت کی شکل میں ملے تھے جُوں کا تُوں قبول کیا اور ان میں کہیں بھی اپنی ذاتی خواہش کو اثر انداز نہ ہونے دیا۔ ان نفوس قدسی کا طرزِ عمل اُن نفس کے بندوں سے ہمیشہ مختلف رہا ہے جنہوں نے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ اور جس حصّے میں اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کا سامان دیکھا اُسے اپنا لیا اور جس میں اپنے مفادات کو خطرہ نظر آیا اُسے بلا تکلف رد کر دیا۔

اہلِ ایمان کا اختلاف اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا پرستوں کے اختلاف سے بہر حال ایک الگ چیز ہے۔ اہلِ ایمان کا باہمی اختلاف انہیں دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتا کیونکہ ان میں اختلاف کے باوجود ایک قوتِ رابطہ ایسی موجود ہوتی ہے جو انہیں فکر وعمل کے اعتبار سے ہم آہنگی عطا کرتی ہے۔ اہلِ ایمان کے درمیان جب بھی نزاع کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے تو نفس

کے محرکات اختلاف کی خلیج کو وسیع نہیں کرتے بلکہ قرآن و سنت کے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی وجہ سے اُن کے درمیان اتحاد و اتفاق کی بے شمار صورتیں نکل آتی ہیں۔ ہاں اگر وہ اپنے اختلافی امور میں خدا اور اُس کے رسولؐ کو حکم بنانے پر آمادہ نہ ہوں تو پھر اُن کا شمار بھی اُسی زمرے میں ہوگا جس میں کہ ایمان سے محروم لوگوں کا ہوتا ہے، جیسے کہ آیت (فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ) میں تصریح موجود ہے۔ لوگوں کا صاحبِ ایمان ہونا اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے جملہ امور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دیں۔ اُن کے ایماندار ہونے کے لیے یہ ایک بنیادی شرط ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو حکم کسی شرط سے مشروط ہو وہ شرط کے ختم ہو جانے سے خود بخود ساقط ہو جاتا ہے۔

پھر مندرجہ بالا آیت میں شَیْءٍ کا استعمال جو لغت کے اعتبار سے اسمِ نکرہ ہے اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ نبوی تمام دینی امور پر محیط ہیں خواہ اُن کا تعلق حیاتِ انسانی کے بنیادی مسائل سے ہو یا روزمرہ کے معاملات سے خواہ وہ انسان کی خارجی زندگی سے بحث کرتے ہوں یا انسان کی داخلی کیفیات سے۔ اگر کتابِ الٰہی اور سنتِ رسولؐ انسان کی پوری زندگی پر حاوی نہ ہوتیں تو پھر اللہ تعالیٰ کبھی یہ حکم نہ فرماتے کہ تمہارے اندر جب بھی کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کے فیصلے کے لیے تم اللہ اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔

.... اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سنت چونکہ حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اسی لیے مومنوں کو اپنے جملہ معاملات خدا اور اُس کے رسولؐ کی بارگاہ میں پیش کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ اُن کے متعلق انہیں صحیح صحیح فیصلہ دیا جا سکے شَیْءٍ کا بطور نکرہ استعمال شریعت کی ہمہ گیری پر دلالت کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان صاف طور پر اس امر کی صراحت کر رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف اپنے اختلافی امور لوٹانے کا مقصد یہ ہے کہ اُن کے بارے میں قرآن مجید کا فیصلہ حاصل کیا

جائے اور رسول اللہؐ کی طرف لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ جب تک اس دنیا میں ہمارے درمیان موجود رہے اُس وقت تک انہیں اپنے ہر معاملہ کا حکم بنایا جائے اور حضورؐ سرورِ کائنات کے دُنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب آپ کی حیات طیبہ کے سارے واقعات اور آپ کے سارے ارشادات جو سنت کی شکل میں محفوظ ہیں اور تواتر کے ساتھ ایک بیش قیمت ورثہ کی حیثیت سے ہم تک پہنچے ہیں اُن کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اس بارگاہِ اقدس سے جو فیصلہ بھی صادر ہو جائے اُسے بے چون وچرا تسلیم کر لیا جائے۔ قرآن مجید کی ان تصریحات پر پوری اُمت کا اجماع ہے۔

قرآن وسنت کو اپنے جملہ معاملات کا حکم بنانا موجباتِ ایمان میں سے ہے اگر کوئی شخص علم و عمل کے ان دونوں سرچشموں کو یہ حاکمانہ حیثیت دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تو پھر اُس کا دعوئے ایمان یکسر بے بنیاد ہے۔ ایمان اور خدا اور اُس کے رسولؐ کی غیر مشروط اطاعت دونوں لازم ملزوم ہیں اگر لازم نہیں تو پھر ملزوم کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہاں تو خصوصیت کے ساتھ دونوں جانب سے تلازم ہے۔

پھر باری تعالیٰ نے یہ ارشاد بھی فرمایا ہے کہ قرآن وسنت کو آخری سند مان کر اپنے اختلافات کا فیصلہ کرنا ہی دنیا اور آخرت میں فلاح وکامرانی کی ضمانت ہے۔ اس کے بعد اس امر کی بھی صراحت فرما دی کہ جو لوگ اپنے جملہ معاملات میں اللہ اور اُس کے رسولؐ کو آخری اتھارٹی تسلیم نہیں کرتے اور قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کی بجائے کچھ دوسرے افکار ونظریات کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے زبانی دعووں کے باوجود طاغوت کے بندے ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے اسے ہی اپنا حکم مان لیا ہے۔ طاغوت سے مراد تمام ایسے انسان یا ادارے ہیں جن کی لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے منہ موڑ کر اطاعت اور پیروی کرتے ہیں۔ یہ لفظ معانی اور مفہوم کے اعتبار سے بڑا وسیع ہے اور اس کے تحت وہ سارے افراد اور اُن کے باطل افکار ونظریات آجاتے ہیں جنہیں لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے احکام کے علی الرغم فیصلے کے لیے آخری سند تسلیم کرتے ہیں یا جن کے سامنے اللہ کو چھوڑ کر سرِ نیاز خم کیا جاتا ہے یا جن کی اللہ اور اُس کے رسولؐ سے بے نیاز ہو کر اطاعت اور پیروی کی جاتی ہے۔

ان سب لوگوں کی گردنوں میں طاغوت کی غلامی کا قلادہ پڑا ہؤا ہے۔ اگر آپ صورتِ حال کا ذرا گہرائی میں اُتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ انسانوں کی عظیم اکثریت نے اپنے خالق و مالک سے عبودیت کا رشتہ توڑ کر طاغوت کی عبادت کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ یہ لوگ خدا کے وجود کا اقرار بھی کرتے ہیں، نبی آخرالزماںؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے دعویدار بھی ہیں لیکن ان کے دعووں میں کوئی صداقت نہیں، کیونکہ عملی اعتبار سے اُنہوں نے طاغوت کی بندگی اختیار کر لی ہے۔ اُن کی زندگی میں جب کبھی فیصلے کا مرحلہ آتا ہے تو وہ خدا اور اُس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کی بجا طاغوت کی چوکھٹ پر گر جاتے ہیں۔ ان بدنصیب لوگوں نے راہِ ہدایت کھو دی ہے۔ وہ یقیناً اُس روش پر گامزن نہیں جس پر چل کر انسان دُنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرتا ہے ___ وہ روشنی جس پر حضور سرورِ دو عالمؐ کے جانثار رفقا کار اور اُن کے متبعین اور اُمت کے دوسرے پاکباز لوگ گامزن رہے ہیں۔ طاغوت پرست ...... نصب العین اور مقصد کے اعتبار سے اُن حضرات سے بالکل الگ ہیں جنہوں نے خالقِ کائنات کو اپنا مالک اور رازق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی اور مطاع تسلیم کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان گم کردہ راہ لوگوں کے اندازِ فکر اور اُن کے طرزِ عمل کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب اُن سے اِس چیز کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی طرف رجوع کریں تو وہ اس مطالبہ سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ اور حق و صداقت کے اس راستہ کی طرف پکارنے والے کی آواز کو سُنی اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ وہ خدا اور اُس کے نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے دوسرے لوگوں کے احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ ظالم اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت پر راضی نہیں ہوتے بلکہ اُن کا دل طاغوت کی غلامی اختیار کرنے پر فرحت محسوس کرتا ہے۔ اور نزع اور اختلاف کی صورت میں طاغوت کے فیصلے پر ہی یہ بدنصیب اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اس گمراہ کن روش کی وجہ سے جب اُن کی عقل پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار پڑتی ہے، اُن کا فہم و ادراک ماؤف ہوتا ہے، اُن کے افکار و نظریات پر باطل کے اندھیرے چھا جاتے ہیں۔

اور اُن کے جسم بیکار اور اُن کے مال رائگاں ہونا شروع ہوتے ہیں۔ تو پھر وہ بڑے معصومانہ انداز میں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا اللہ اور اُس کے رسول سے اعراض کسی فسادِ نیّت پر مبنی نہیں بلکہ ہمارے ارادے نیک اور نفسانیت کی ہر آلائش سے یکسر پاک ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان اتفاق و اتحاد پیدا ہو اور فکر و عمل کے لیے کوئی ایسی بیچ کی راہ نکال لی جائے جس پر احکامِ رسول ﷺ کے ماننے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے دونوں متفق و متحد ہو سکیں۔ وہ اپنے زعم میں خیر و فلاح کے علمبردار بنتے ہیں۔ شریعت کے معاملے میں یہ اندازِ فکر انتہائی افسوسناک ہے۔ ایمان کا تو بنیادی تقاضا یہ ہے کہ صاحبِ ایمان ہر اُس چیز کے خلاف صف آرا ہو جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ شریعت کے مخالف ہے خواہ اُس چیز کا تعلق طریقت و معرفت سے ہو، عقیدہ و عمل سے یا سیاست و معاشرت سے۔ باطل افکار و اعمال کے لیے دل میں نفرت کا احساس اور پھر انہیں مٹانے کے لیے عملی جدوجہد ایمان کی سب سے بڑی علامت ہے۔ وہ لوگ جو حق و باطل کی آمیزش کرکے ہر گروہ کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کا ایمان خطرے میں ہے۔ حمیتِ دینی ایمان کا ایک لازمی خاصہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حق کی پیروی کی توفیق صرف اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہے۔

پھر خداوند تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر یہ فرمایا ہے:

لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء - ۹)	یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر بھی اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سرِ تسلیم خم کر لیں۔

اس آیت میں نزاعی امور میں حضور سرورِ کائنات کی غیر مشروط تحکیم کو ہی ایمان کی ضروری شرط قرار نہیں دیا گیا بلکہ مسلمانوں کو یہ بات بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ وہ حضور کے بارے میں تسلیم و رضاء کا ایک ایسا انداز اختیار کریں جس کی وجہ سے حضورؐ کے فیصلے اُن کے لیے دل گرفتگی کی بجائے سکون اور اطمینان کا موجب ہوں۔ قلب و دماغ کے اندر یہ کیفیّت صرف اُسی صورت میں پیدا

ہو سکتی ہے جب حضور کی ذات کے ساتھ غیر معمولی محبت و عقیدت ہو اور آپ کے احکام اور ارشادات پر غیر معمولی یقین اور اعتماد ہو۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر یہ حکم صادر فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب۔ رکوع ۴)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اُسے اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنیکا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے فیصلے کے بعد اگر کوئی مسلمان اپنی خواہش نفس سے فیصلہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت گمراہی کو دعوت دیتا ہے۔

پھر سورۃ الحجرات میں مسلمانوں کو اس امر کی تاکید کی:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (رکوع ۔۱)

اے ایمان والو اللہ اور رسول سے آگے نہ بڑھو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو) سننے والا (اور تمہارے سب اعمال کو) دیکھنے والا ہے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی امر کے بارے میں اپنی رائے ظاہر نہ فرمادیں تم اُس وقت تک خاموش رہا کرو۔ تمہیں حضورؐ کے حکم کا ہر معاملہ میں انتظار کرنا چاہیئے۔ اور انہیں کے دیئے ہوئے فتووں کی روشنی میں اپنے معاملات طے کرنے چاہئیں۔ ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے رسولؐ کے حق میں اپنی جملہ خود مختاریوں سے دستبردار ہو چکے ہو۔ تمہارا کام اب حضورؐ کے فیصلوں پر عمل کرنا ہے۔ اللہ کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سنت کو پسِ پشت ڈال کر

تم جو قدم بھی اٹھاؤ گے وہ تمہیں بربادی کی طرف دھکیل دیگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بلیغانہ بات ارشاد فرمائی :

ایک مسلمان کو کتاب اور سنت رسولؐ کے خلاف قطعاً زبان نہ کھولنی چاہیئے مسلمانوں کو اس بات کی ممانعت کردی گئی ہے کہ وہ اللہ کے رسول کے فیصلے سے پہلے کوئی فیصلہ دینے کی جسارت کریں۔

یہ مختصر قول جو درحقیقت مندرجہ بالا آیت کی نہایت عمدہ تفسیر ہے اس بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ چیز ایمان کے یکسر منافی ہے کہ کوئی شخص رسول خدا کی محبت اور اطاعت کا دعوٰے بھی کرے اور پھر اپنے دل پسند افکار و اعمال کو حضورؐ کے ارشادات و افعال پر مقدم رکھنے کی مذموم کوشش کرے۔

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم بھی دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (الحجرات رکوع ۱)

اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ہی اُن سے ایسی اونچی آواز میں گفتگو کیا کرو جس طرح کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں تمہاری بے خبری ہی میں ہی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں۔

جس بزرگ و برتر ذات کے بارے میں قرآن حکیم نے صریحاً یہ حکم فرمایا ہے کہ تم اُس کی آواز سے اپنی آواز کو بلند نہ ہونے دو۔ اور اُس کی بارگاہِ اقدس میں جب بھی گفتگو کرو تو یہ امر ہمیشہ ملحوظ خاطر رہے کہ تم کسی عام انسان سے محو تکلم نہیں ہو بلکہ ایک ایسی مقدس ذات کے سامنے لب کشائی کر رہے ہو جو انتہائی واجب الاحترام اور قابلِ تعظیم ہے اور جس کے حضور میں آواز کی ذرا سی شوخی اعمال کی بربادی کا باعث بن سکتی ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ اگر طرز تکلم کی معمولی سی بے احتیاطی سے اعمال ضائع ہوسکتے ہیں تو پھر اُن لوگوں کا حشر کیا ہوگا جو اپنی آرا، اپنے افکار و نظریات، اپنے فہم و

تدبّر اپنے ذوق کو حضور کے ارشاداتِ عالیہ پر مقدّم رکھتے ہیں۔ کیا ان بدنصیب لوگوں کی اس غلط روش کی وجہ سے اُن کے سارے اعمال دریا برد نہ ہو جائیں گے۔

پھر قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ

مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور رسول کو دل سے مانیں، اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ (سورۂ نور رکوع ۹)

قرآن مجید نے حضور سرورِ دو عالم کے معاملے میں اس قدر احتیاط کی تلقین کی ہے کہ اُن کی بارگاہ سے جاتے ہوئے یا سفر میں اُن سے الگ ہوتے ہوئے اُن سے باقاعدہ اجازت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اسے مقتضیاتِ ایمان میں سے ایک اہم تقاضا شمار کیا ہے جس دین کا حضور کے بارے میں احساس اتنا نازک ہو اُس میں یہ بات کب گوارا کی جا سکتی ہے کہ لوگ حضور کی منشا اور مرضی کے بغیر جس طرح چاہیں عقل کے گھوڑے دوڑائیں۔ اور اُن وادیوں میں بھٹکتے پھریں جن میں قدم رکھنے سے حضور نے منع فرمایا ہے۔

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے جس علم سے تمہیں سرفراز فرمایا ہے اُس سے تمہیں کبھی محروم نہ کریگا البتہ علماء کی موت سے وہ علم تم سے چھین لیا جائے گا۔ پھر جہلا باقی رہ جائیں گے۔ اور عوام مسائل دریافت کرنے کے لیے انہیں کی طرف رجوع کریں گے اور یہ جاہل اپنی ذاتی رائے کے مطابق فتوے دیں گے۔ یہ خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہی کے راستے پر ڈالیں گے۔ ایک دوسری سند سے اسی حقیقت کو الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ یوں بیان فرمایا گیا ہے:

"اللہ تعالیٰ لوگوں کے سینوں سے علم کو محو نہیں کرے گا البتہ علماء کی موت سے علم ان سے چھین لیا جائے گا۔ جب علماء باقی نہ رہیں گے تو پھر قیادت اور سیادت کا منصب جہلاء

کے ہاتھ میں آئے گا جو اپنی منشاء کے مطابق فیصلے دیں گے۔ وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور اپنے متبعین کو بھی گمراہ کریں گے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تک جب عبداللہ بن عمرو کی یہ روایت پہنچی تو آپ نے اپنے بھانجے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اے میری بہن کے لختِ جگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو حج کے لیے تشریف لا رہے ہیں، تم اُن سے مل کر اس حدیث کے متعلق دریافت کرو، کیونکہ انہوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھرپور فیض حاصل کیا ہے۔

چنانچہ عروہ بن الزبیر تعمیلِ ارشاد میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے ملے اور اُن سے بہت سے مسائل دریافت کیے جن کے بارے میں وہ حضور سرورِ کائنات کے امین تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے جہاں دوسرے تصریح طلب امور پر بحث کی وہاں یہ بھی فرمایا:

"اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کو علم کی نعمت سے نوازتا ہے تو انہیں اس سے محروم نہیں کرتا البتہ جب علمائے ربانی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو پھر اُن کے ساتھ علم بھی ناپید ہو جاتا ہے۔ اور مسندِ افتاء ایسے جاہلوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو علم کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں، وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔"

عروہ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ میں نے جب یہ بات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جا کر بیان کی تو انہیں یہ بات بہت بڑی معلوم ہوئی اور پھر کہا:

کیا عبداللہ بن عمرو نے تم سے یہ فرمایا ہے کہ انہوں نے یہ بات حضور سرورِ دوعالم سے سُنی ہے؟

عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں انہوں نے مجھ سے یہی کہا ہے۔

جب اگلے سال حج کا موسم آیا تو پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عروہ بن الزبیر سے ارشاد فرمایا:

"اس مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ پھر حج کے لئے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ تم اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے اس حدیث کے بارے میں پھر دریافت کرو۔"

عروہ اپنی خالہ محترمہ کے ارشاد کے مطابق اب کی بار پھر حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس حدیث کے متعلق سوال کیا۔ اُنہوں نے اس مرتبہ بھی بعینہ وہی الفاظ کہے جو اُنہوں نے گزشتہ سال فرمائے تھے۔ عروہ کہتے ہیں کہ میں نے جب اس روایت کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس جا کر بیان کیا تو آپ نے فرمایا:

"حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے واقعی بالکل سچ کہا ہے اور اس میں اُنہوں نے کسی ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں کی۔"

حضرت عوف بن مالک الاشجعیؓ سے ایک روایت مروی ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"میری اُمت ستر سے کچھ اوپر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سب سے زیادہ فتنے میں وہ فرقہ مبتلا ہوگا جو دینی امور میں اٹکل پچو سے کام لیگا۔ وہ چیزیں جو اللہ نے حرام کی ہیں ان کی حلت کا فتوے دیگا۔ اور جن چیزوں کو اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے وہ ان کی حرمت کا دعویدار ہوگا۔"

ابو عمر بن عبدالبر نے اسی حدیث کی صراحت کرتے ہوئے کہا ہے:

"یہ حدیث اُن لوگوں سے بحث کرتی ہے جو دینی امور میں قرآن و سنت کو اساس تسلیم کرنے کی بجائے اپنی عقل خام کو رہنما بناتے ہیں اور اسی کے مطابق دین کے اندر کلام کرتے ہیں۔"

حلال چیزوں کی حلت قرآن و سنت ہی سے اخذ کی جا سکتی ہے اور حرام کی حرمت کے بارے میں قرآن و حدیث ہی آخری سند ہیں جس شخص کی رسائی رشد و ہدایت کے ان دونوں سرچشموں تک نہ ہو گی وہ بہر حال اپنی ذاتی رائے ہی سے ان اہم امور کے بارے میں فیصلے دیگا۔ وہ خود بھی گمراہ ہوگا

اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ اس کے برعکس جو شخص فروعات کو قرآن وسنت کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرے گا وہ حق و صداقت کے راستے پر گامزن ہوگا۔

باقی رہے وہ امور جن کے بارے میں قرآن وسنت دونوں خاموش ہیں سو اُن کے متعلق اگر کوئی شخص اپنے فہم کو استعمال کرکے کوئی رائے دیتا ہے تو وہ رائے مذموم نہیں۔ لیکن اس معاملے میں بھی یہ احتیاط ہمیشہ پیش نظر رہے کہ اس کی یہ رائے دین کے مزاج سے ہم آہنگ ہونی چاہیئے۔[1]

باقی رہے وہ معاملات جن کے متعلق قرآن وسنت کی تصریحات موجود ہیں اُن میں کسی شخص کی ذاتی رائے کو کوئی دخل حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی فتنہ پرداز قرآن وسنت کے واضح احکام کے باوجود اپنی رائے کو ہی ترجیح دینے پر مصر ہے تو اُسے اس وعید پر غور کرنا چاہیئے جس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کرچکے ہیں۔

مسند عبید بن حمید میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے واضح الفاظ میں یہ فرمایا:

"جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کلام کرے اُسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔"

---

[1] یہ ہمارے اپنے الفاظ ہیں (مترجم)

نبوّت کی ضرورت

(۵)

عبدالحمید صدیقی

گذشتہ "ترجمان القرآن" میں ہم نے بتایا تھا کہ اس کائنات کے آغاز و انجام کے بارے میں سائنس نے تذبذب کا جو موقف اختیار کیا ہے اُس سے انسان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ اس کے متعلق اپنے دل و دماغ میں کوئی قطعی اور حتمی فیصلہ کرے کیونکہ اس کا یہ فیصلہ ہی اُس کی جدوجہد کا رُخ متعین کرتا ہے۔

ایک طرف انسان کا یہ فطری مطالبہ ہے اور دوسری طرف سائنس اس معاملہ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس پاتی ہے۔ سائنس دان خواہ زبان سے برابر اس بات کا دعوےٰ کرتے رہیں کہ ہم جو حقائق نوعِ انسانی کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ حتمی اور قطعی ہیں اور ان میں دو رائیں ممکن نہیں ہو سکتیں لیکن سائنس کا اپنا مزاج خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس میں وہ قطعیت و حتمیت پیدا نہیں ہو سکتی جو مذہب کا طغرۂ امتیاز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس دان اگرچہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ ان کے نظریات کا سارا دارومدار حقائق کے مطالعہ و مشاہدہ پر ہے لیکن یہ ایک ایسا دعوےٰ ہے جس کی سائنس دان قدم قدم پر تکذیب کر رہے ہیں۔ سائنس کا اصل مدار حقائق کے مطالعہ و مشاہدہ کی بجائے علّت و معلول کی کڑیوں اور قانونِ یکسانیت کی کارفرمائی پر ہے۔

کسی انسان کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ حقائق کا اس انداز سے مطالعہ و مشاہدہ کر سکے کہ کائنات کا کوئی گوشہ اور حیاتِ انسانی کا کوئی پہلو اُس کی نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ سائنس دانوں نے اپنی اس بے بسی اور درماندگی کو بالکل آغاز ہی میں پوری طرح محسوس کر لیا

تھا اس لیے اُنھوں نے حقائق سے نتائج اخذ کرنے میں زیادہ تر انحصار قانون یکسانیت پر کیا ہے۔
کائنات کے پورے حقائق کے مطالعہ اور مشاہدہ کی بجائے قانون علّت اور قانون یکسانیت پر اعتماد خود اس بات کا ثبوت ہے کہ سائنس دانوں کا اپنا موقف بڑا کمزور ہے اور اپنے کسی نظریہ کے معاملے میں وہ کوئی قطعی رائے دینے سے قاصر ہیں۔

جس چیز کو یہ حضرات مطالعہ و مشاہدہ کے دلفریب نام سے پکارنے کے عادی ہیں اُس کی حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی مختلف اشیاء حواس کی زد میں آکر انسان کے قلب و دماغ پر ایک خاص نوعیت کے تاثرات پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اگر سائنس دان اپنے اسی دعوے پر قناعت کرتے تو اختلاف کی کوئی زیادہ گنجائش پیدا نہ ہوتی۔ نزاع کا آغاز اُس مقام سے شروع ہوتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا یہ مشاہدہ و مطالعہ بالکل صحیح اور درست ہے اور اُنھوں نے اس سے جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کو کسی صورت بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

اگر سائنس دانوں کے اس دعوے کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے اس دعوے کی حقیقت لاف زنی سے کچھ زیادہ نہیں۔

سب سے پہلے کوئی شخص جو کچھ بھی عقل رکھتا ہے یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اُس کے حواس ہر لحاظ سے صحیح اور درست ہیں اور وہ چیزوں کو جس انداز سے ادراک کرتے ہیں ان میں کوئی سقم نہیں آسکتا۔ حواس میں غلطی کا پورا پورا امکان ہے اور ان کے نتائج میں بھی شک و شبہ کی پوری گنجائش موجود ہے۔

حضرت امام غزالیؒ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف المنقذ میں حواس پر نہایت مختصر مگر فکر انگیز بحث کی ہے۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ جب تحقیق اور تجربہ سے انہیں یہ معلوم ہُوا کہ نفس انہیں یقین کی دولت عطا نہیں کر سکتا تو پھر اُن کی نظریں حسّیات کی طرف متوجہ ہُوئیں اور اُنھوں نے یہ سوچا کہ شاید ان کے ذریعے ہی انہیں یہ دولت ہاتھ آجائے لیکن اس معاملے میں بھی انہیں سخت ناکامی ہوئی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ قوتیں یا حسّیں جن پر ہمارے مشاہدہ کا سارا دار و مدار ہے،

وہ بھی ہمیں قدم قدم پر دھوکہ دیتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان جب سایہ کو دیکھتا ہے تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی حرکت وجنبش نہیں اس لیے وہ اسے ساکن ہی سمجھتا ہے درانحالیکہ یہ سایہ برابر حرکت کرتا رہتا ہے۔ ہاں اس کی حرکت دفعتاً اور اچانک ظہور میں نہیں آتی بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج ظہور میں آتی ہے۔ اسی طرح جب یہ آنکھ ستارے کو دیکھتی ہے تو اسے یہ نہایت چھوٹا نظر آتا ہے لیکن دوربین سے یہ بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔ پھر ہندسی دلائل سے بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ فضائے آسمانی میں ہمیں جو ننھی ننھی قندیلیں جھلملاتی نظر آتی ہیں اُن میں سے کئی ایک ایسی ہیں جو وسعت کے اعتبار سے اس کرۂ ارضی سے کئی گنا بڑی ہیں اور لاتعداد سیارے اور ستارے ایسے ہیں کہ ابھی انسان کے ادراک سے بھی باہر ہیں۔

اس بنا پر سائنس دانوں کا یہ دعویٰ کہ وہ محض مشاہدہ کی مدد سے حقیقت کا پوری طرح ادراک کر سکتے ہیں بالکل غلط ہے اور یہ بالکل اُسی طرح کی لاف زنی ہے جس کا اظہار گذشتہ دنوں اُس روسی ہوا باز نے کیا جس نے فضا میں زمین کے گرد چند چکر لگا کر کہا کہ مجھے یہاں خالق کائنات کے وجود کا کہیں نشان نہیں ملا۔ اُس عقل کے اندھے نے یہ سمجھا ہے کہ زمین سے چند ہزار میل کی بلندی پر جانے سے ساری کائنات اُس کی زد میں آگئی ہے اور اب اس کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جو اُس کے ادراک سے ماوراء ہو۔ اُس کا مشاہدہ ہر لحاظ سے ہمہ گیر ہے اور اُس کی نظر ہر موجود چیز کو دیکھنے کی پوری طرح قدرت رکھتی ہے۔

لیکن یہ سراسر زعم باطل ہے یہ ضروری نہیں کہ جو چیز موجود ہے وہ لازمی طور پر ہمارے مشاہدہ کی گرفت میں بھی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اُس کے متعلق ہمارے حواس نے جو فیصلہ بھی صادر کیا ہے وہ بھی سو فی صد حق و انصاف پر مبنی ہو۔

پہلے بالفرض ہم ایک لمحہ کے لیے یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ انسان کے حواس قابل اعتماد ہیں، اور ان کے ذریعے انسان جو نتائج حاصل کرتا ہے اُس میں کسی حد تک وثوق پایا جاتا ہے لیکن یہاں آکر پھر ایک سوال انسان کے ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا انسان کی ان قوتوں میں اتنی استعداد

موجود ہے کہ وہ کائنات کا پوری طرح احاطہ کر سکیں۔

مجرد مشاہدہ اور مطالعہ تو کائنات کے کسی ایک گوشے کو بھی اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہے۔ البتہ اُس نے اپنے دائرہ کو قانون یکسانیت کے ذریعے کافی حد تک پھیلا دیا ہے۔ انسان کے حواس جب فطرت کے عمل کو بار بار دیکھتے ہیں تو پھر دوسرے بہت سے عوامل کو اس ایک عمل پر قیاس کرتے ہوئے پہلے عمل کے مطابق اُن سے نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ اس فکری زقند نے سائنس دانوں کے کام کو بہت مختصر اور آسان بنا دیا ہے۔ لیکن اس میں بھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر دل مطمئن نہیں ہوتا۔

اس طرز استدلال کی رُو سے مشاہدہ بذاتِ خود ایک ایسا عمل قرار پاتا ہے جس میں حواس سے کہیں زیادہ انسان کی قوتِ فکر کام دیتی ہے۔ کسی ایک چیز کو دیکھ لینے سے ہم اُس کی حقیقت نہیں جان سکتے۔ جب ہم کسی چیز پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اُس کے مدھم اور غیر مربوط نقوش ہمارے دماغ کی لوح پر اُبھرتے ہیں۔ پھر ہمارا ذھن ان نقوش کو اپنی استعداد اور ضرورت کے مطابق فکھارتا ہے اور اس کے بعد وہ ان کے اندر ترتیب پیدا کر کے اُس کی صورت گری کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں مراحل کے طے کرنے کے بعد بھی ذہن کا کام ختم نہیں ہوتا۔ وہ پھر اس چیز کو دوسری دیکھی اور ان دیکھی اشیاء کے ساتھ احساس کے ایک غیر مرئی رشتے میں منسلک کرتا ہے اور اس طرح اُس کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔

آپ خود ان سارے مراحل پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مجرد قوت باصرہ بالکل بیکار ہے۔ اس کی افادیت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر ذہنی قوت موجود ہو، جو مشاہدہ کے تاثرات میں نظم و ربط پیدا کر کے انہیں مفید اور کارآمد بنائے۔ انسانی ذھن آئینہ کی طرح نہیں ہوتا، جس میں فطرت اپنا عکس جوں کا توں ڈالتی ہے۔ وہ انفعالی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ شعوری طور پر مختلف عناصر و اجزا کے امتزاج سے فطرت کا تصور قائم کرتا ہے اور مقاصد کے تحت معروضی حقائق میں تصرف چاہتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ انسان کا مشاہدہ بالکل بے لوث ہے صحیح نہیں۔ انسان

جب بھی مشاہدہ کرتا ہے تو اُس میں صرف اُس کی قوتِ باصرہ ہی کام نہیں کرتی بلکہ دل و دماغ کی بہت سی قوتیں شامل ہوتی ہیں اور ناظر کے اپنے احساسات و افکار کا پسِ منظر اُس کے مشاہدہ کو نہ صرف ایک خاص ترتیب دیتا ہے بلکہ اُسے ایک خاص رنگ میں بھی رنگ دیتا ہے۔ اسی حقیقت کو آپ ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے:

ایک انسان جو ایک بلند و بالا ذات پر ایمان رکھتا ہے اور دل و جان سے یہ مانتا ہے کہ یہ کارخانۂ قدرت یونہی بغیر کسی مقصد کے معرضِ وجود میں نہیں آگیا بلکہ ایک قادرِ مطلق ذات نے پورے تدبّر کے ساتھ ایک خاص مقصد کے تحت اسے تخلیق کیا ہے۔ وہ جب فطرت کا مشاہدہ کرے گا تو اُس کے ذہن میں اس مشاہدہ کے تاثرات اُس شخص کے تاثرات سے یکسر مختلف ہونگے جو اس کائنات کو کسی مدبّر کی تدبیر کا نتیجہ سمجھنے کی بجائے اسے بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی سمجھتا ہے۔ ایک دہریہ جب فضا میں پرواز کرتا ہوا اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے یوں نظر آتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک نہیں۔ لیکن اُس کے برعکس جب ایک خداپرست اس طرح کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے قدم قدم پر اللہ کے وجود کے نشانات ملتے ہیں۔ اُس کی نگاہ میں جوں جوں وسعت پیدا ہوتی ہے اتنا ہی خالقِ کائنات پر اُس کا اعتقاد و ایمان مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ کائنات ایک ہے لیکن اس کے مشاہدے سے دو الگ الگ طرز پر سوچنے والے انسان ایک دوسرے سے مختلف نتائج کیوں اخذ کرتے ہیں؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مختلف انسانوں کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتا ہے اور وہ اپنی ذہنی ساخت کے مطابق اپنے اس مشاہدہ کو ترتیب دیتے ہیں اور اپنے رجحان کے مطابق اس میں رنگ بھرتے ہیں۔

ہماری ان گذارشات سے یہ حقیقت منکشف ہوگئی ہوگی کہ وہ چیز جسے ہم مطالعہ و مشاہدہ کہتے ہیں اُس میں قوتِ باصرہ سے کہیں زیادہ انسان کے افکار و تصوّرات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم محض حواس پر اعتماد کر کے حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں ایک

وہم ہے۔

علامہ ابنِ خلدون نے اپنی مشہور کتاب "مقدمہ" میں "علم الکلام" کے تحت اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ بڑی فکر انگیز ہے اور اس معاملہ کے بہت سے پہلوؤں کو واضح کرتی ہے ہم یہاں اُس کا ایک حصّہ نقل کرتے ہیں:

"بعض انسان اس زعم میں مبتلا ہیں کہ موجوداتِ عالم اُن کے قوائے مدرکہ سے باہر نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک ایسا دعوےٰ ہے جس کی عقل اور مشاہدہ دونوں تائید نہیں کرتے۔ آپ کسی بہرے کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس کے علم کے ماخذ صرف چار حواس ہی ہیں۔ وہ انہیں میں عالمِ وجود کو محدود و محصور پاتا ہے۔ مسموعات اس غریب کے شمار سے نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اندھا اُس چیز کا انکار کرتا ہے جو صرف قوّتِ باصرہ کی زد میں آنے والی ہو۔ اس قسم کے اندھے اور بہرے محض اپنے آباؤ اجداد کی باتوں پر اعتماد اور یقین کر کے اُن چیزوں کے وجود کا اقرار کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جن میں اُن کے حواس اُن کی اعانت اور دستگیری نہیں کرتے .... یہ عین ممکن ہے کہ اس کائنات میں ایسے مدرکات موجود ہوں جو ہمارے علم و ادراک سے باہر ہوں .... اور حقیقت تو یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی ان کا پوری طرح احاطہ کر سکتی ہے۔ اگر کسی وقت آپ یہ دیکھیں کہ آپ کا ادراک اپنے فطری حدود سے تجاوز کر رہا ہے تو آپ فوراً محتاط ہو جائیں اور سمجھ لیجئے کہ یہ کسی فریب میں مبتلا ہو رہا ہے اُس وقت آپ کی عافیت کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ شارع علیہ السلام کے بتائے ہوئے عقیدہ اور عمل کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں کیونکہ شارع علیہ السلام آپ سے زیادہ آپ کے خیر خواہ ہیں اور آپ سے کہیں زیادہ آپ کی بھلائی کے طالب ہیں۔ اُن کی ذات کو وہ ادراک نصیب ہے جس کی آپ کے ادراک و عقل کو ہوا تک بھی نہیں لگی" (صفحہ ۵۹ م ۔ ۶۰ م)

یہ تو ہے مشاہدہ کا صرف ایک پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ مشاہدہ اپنے عمل کے لئے صرف ذہن انسانی کا محتاج نہیں بلکہ اپنے دائرہ کار کو وسیع کرکے اُس سے نتائج اخذ کرنے کے لیے وہ ہر قدم پر قانون یکسانیت کے تعاون کی ضرورت محسوس کرتا ہے اگر مشاہدہ اس قانون سے اپنا رشتہ منقطع کردے تو سائنس کے سارے انکشافات باطل قرار پائیں۔

سائنس کا قانون یکسانیت پر انحصار کوئی ایسا طرزِ عمل نہیں جس کی عقل تائید نہ کرتی ہو۔ انسان کی فکری اور علمی صلاحیتیں بڑی محدود ہیں اور اُن کے اندر یہ حوصلہ نہیں کہ وہ کائنات کے ہر جزو کو صحیح طریق سے ادراک کر سکیں۔ اس بناء پر وہ بیچاری مجبور ہیں کہ ایک محدود تجربہ کے تحت اُنہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اسے وسیع کائنات پر پھیلا کر نتائج کا استنباط کریں۔

انسان کا ذہن ایک ثانیہ کے لیے بھی خلا میں نہیں رہ سکتا۔ وہ کائنات کے بارے میں ایک مجموعی تاثر قائم کرنے کا ہر وقت طالب ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بڑی سرعت کے ساتھ اپنے روزمرّہ کے مشاہدات اور تجربات سے جو فی الواقع حقیقت کا بالکل مبہم سا احساس پیدا کرتے ہیں، پوری کائنات کے بارے میں ایک مجموعی تاثر قبول کرتا ہے اور پھر اسی کی روشنی میں باقی جزئیات کا مطالعہ کرتا ہے۔

انسان کے مشاہدے اور قانون یکسانیت میں ایک نہایت قریبی تعلق موجود ہے۔ وہ کسی شے کا جس انداز سے مطالعہ کریگا اُسی انداز کے مطابق پوری کائنات کا احاطہ کرنے کے لیے وہ قانون یکسانیت کو ترتیب دیگا۔ یہ ضروری نہیں کہ فطرت کے رنگا رنگ مظاہر میں ایک شخص کو جس نوعیّت کی یکجہتی نظر آتی ہے دوسرے کو بھی لازمی طور پر اُسی طرح کی یکجہتی محسوس ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ سائنس دان اس بات کے دعویدار ہیں کہ قانون یکسانیت کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر رکھی گئی ہے اس لئے یہ قانون حتمی اور قطعی ہے لیکن اس معاملے میں بھی سائنس دانوں نے اُسی طرح کی ٹھوکر کھائی ہے جس طرح مشاہدہ کے بارہ میں کھائی تھی۔ قانون یکسانیت کا تعلق بھی مشاہدہ سے زیادہ انسان کے ذہن سے ہے۔ مشاہدہ صرف انسان کے دماغی کارخانہ کو خام مال مہیّا کرتا ہے۔

جہاں اس کے مختلف اجزائے کے درمیان یکسانیت پیدا کرکے انہیں علت و معلول کی کڑیوں میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ قانون اپنے وجود کے لیے مشاہدہ سے زیادہ ذہنی قوت کا دست نگر ہے۔ ایک مشہور مفکر نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :

> فطرت کے یہ قوانین جن کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں ان کی ترتیب و تدوین میں ہمارے حواس اور ذہنی قوتیں دونوں شریک ہوتی ہیں اور دونوں مل کر ہمارے قلب و دماغ پر ایک تاثر قائم کرتی ہیں۔۔۔۔ ان کی صحت کا انحصار اُس مشین پر ہے جو مشاہدہ کے بعد ان کے اندر ایک فکری ربط پیدا کرتی ہے۔[۱]

پھر یہ فکری ربط بھی محض مشاہدہ کی قوت اور ذہنی صلاحیت سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کے پیدا کرنے میں سب سے بڑا دخل اُس مجموعی تاثر کا ہوتا ہے جو انسان اس کائنات کے بارے میں قائم کرتا ہے۔ انسان کا مشاہدہ اور تجربہ چونکہ محدود ہے اور انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کائنات کے ایک جزو کا مطالعہ کرکے اُس کے متعلق تاثر قائم کرے۔ اس لیے وہ غیر شعوری طور پر بہت سی ایسی باتوں پر ایمان لے آتا ہے جو اُسے بظاہر مادی دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت وہ مادہ سے ماورا ہوتی ہیں لیکن اُن میں کسی حد تک یہ صلاحیت ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ انسان کے بنیادی احساسات و تاثرات کی صورت گری کرسکیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ مادی دنیا کے طلسم ہوشربا میں گرفتار رہ کر اُن روحانی قوتوں سے لذّت آشنا ہو جو نہ صرف اُسے اس کائنات کے بارے میں ایک مجموعی تاثر قائم کرنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ اُسے یقین کی لازوال دولت سے بھی مالا مال کرتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جن چیزوں کو ایک خدا پرست روحانی کہتا ہے وہ ایک مادہ پرست کے نزدیک بھی روحانی ہی ہوں۔ لفظ "روحانی" میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان کا قلب و دماغ کائنات کا مشاہدہ

---

[۱] Lecomte du Nouy: Human Destiny p. 22.

ومطالعہ کرنے کے ساتھ اُس حقیقت کبریٰ کا ادراک کرنے کے لیے بھی بے تاب ہوتا ہے جس سے تعلق قائم کیئے بغیر وہ مادی دنیا کی بھول بھلیوں سے نکل کر کائنات کے بارے میں ایک روحانی تاثر قائم نہیں کر سکتا۔ یہ روحانی تاثر ہی اصل میں اُس کے فکر و احساس کا منبع و ماخذ ہے۔ فلسفۂ مذہب کے مصنّف جان کیرڈ نے اس موضوع پر نہایت فکر انگیز بحث کی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

"مادہ پرست یوں تو اس بات کا دعویدار رہے کہ اُس کا تعلق صرف مادہ، تجربہ اور مشاھدہ سے ہے، لیکن وہ اپنے ان تجربات اور مشاھدات میں ایسی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے مثلاً قوت، قانون، جن کا تعلق مادی اشیاء سے کہیں زیادہ روحانی چیزوں سے ہے۔ وہ زبان سے ہر اُس چیز کی نفی کرتا ہے جو محسوسات سے ماورا ہو لیکن وہ عملی زندگی میں مافوق الطبعی چیزوں پر اعتماد کیئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ وہ اپنی تحقیق میں برابر وحدت، کثرت، یکسانیت، علّت و معلول اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے تصوّرات سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور انہیں بسا اوقات بغیر کسی نظم کے استعمال بھی کرتا ہے۔ یہ سب تصوّرات اپنی نوعیّت کے اعتبار سے مافوق الطبعی ہیں۔ اس لیے ایک مادہ پرست لاشعوری طور پر روحانیت کا علمبردار ہوتا ہے۔"

انسانی فطرت کا دوسرا بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور خود انسان کی تخلیق کا کیا مقصد ہے۔ کیا یہ سارا کارخانہ قدرت محض کھیل تماشہ کی حیثیت رکھتا ہے جو مادّہ کی اندھی بہری قوتوں کے ذریعہ بالکل بخت و اتفاق سے معرض وجود میں آگیا ہے یا اس کی تخلیق کے پیچھے ایک مقصد کارفرما ہے۔ یہ سوال پہلے سوال سے بھی زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔ اسی سوال کے صحیح جواب پر انسانی عزّ و شرف، انسانی آزادی، انسانی اخلاق اور احساس جوابدہی کا دارومدار ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ سوال انسان کے لیے جتنا اہم اور ضروری ہے اتنی ہی سائنس اس کے جواب دینے میں ناکام ہوئی ہے۔ سائنس دان بالکل کھُل کر اس کا

اعتراف کرتے ہیں کہ سائنس کا کام عالم طبعی کے مختلف گوشوں کی صرف نقاب کشائی ہے۔ یہ کائنات کس مقصد کی تکمیل کے لیے معرضِ وجود میں آئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا سائنس کے پاس قطعاً کوئی جواب نہیں اور نہ وہ اس کا جواب دینے کی کچھ استعداد رکھتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے سائنس دانوں نے اس حقیقت کو کھلے الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ اپنی ایک فاضلانہ تصنیف میں صاف طور پر لکھتا ہے:

" سائنس جس کا سارا انحصار اور دار و مدار صرف حواس پر ہے اور جو مشاہدہ کے ایک ذریعہ کے علاوہ اور کسی ذریعہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی، اگر یہ دعوے کرے کہ وہ تنہا زندگی کے سارے مسائل کو حل کر سکتی ہے، تو اس کا یہ دعوے بالکل لغو اور بیکار ہے۔ سائنس اس کائنات میں افراد کے لئے مسرت و شادمانی کا کوئی سامان مہیا نہیں کر سکتی، وہ اس کائنات کی تخلیق کے اندر کسی مقصد کی نشان دہی کرنے سے بھی قاصر ہے۔ اُس کا تعلق تو محض اُن اصولوں سے ہے جن کے تحت اس کارخانہ قدرت میں فطرت اپنے عمل کو دُھراتی ہے[۱]۔"

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے نہ تو کوئی مقصد کام کر رہا ہے اور نہ ارادہ کارفرما ہے تو پھر یہ سارا نظام مادہ کے ہاتھ میں صرف ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے جس سے مادہ جس طرح چاہیے کھیلتا رہے۔ کائنات کی جو کچھ قدر و قیمت ہے۔ وہ مقصد کے تحت ہی ہے۔ اگر مقصد آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

اس مقام پر وہی اُلجھن پیش آتی ہے جو ہمیں پہلے سوال میں پیش آئی تھی یعنی ہماری فطرت سب سے پہلے اس چیز کا مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے بارے میں جس سے ہمیں ہر وقت سابقہ درپیش ہے ایک اساسی نقطہ نظر قائم کریں۔ کیونکہ یہ نقطہ نظر قائم کئے بغیر

An Introduction to the Philosophy of Religion

ہم کائنات کیساتھ کوئی جذباتی اور شعوری تعلق قایم نہیں کر سکتے ہیں ہمیں اس کائنات میں ایک غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے نہیں اُتارا گیا۔ ہمارا اس سے ایک نہایت ہی گہرا رابطہ ہے۔ اس کے مناظر، اس کی قوتیں اور اس کی وسعتیں ہر لمحہ ہم پر اثرانداز ہوتی ہیں اور دوسری طرف ہم بھی انہیں ہر لمحہ متاثر کرتے رہتے ہیں۔

اگر انسان کائنات میں پیدا ہو کر اُس سے بالکل بے تعلق رہ سکتا تو پھر مقصد کے تعیّن کی زیادہ ضرورت پیش نہ آتی لیکن جب انسان اور کائنات کے درمیان ایک نہایت ہی گہرا رابطہ موجود ہے۔ بلکہ انسان کائنات کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہے۔ تو ان حالات میں انسان تخلیق کائنات کے مقصد سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے ساتھ شعوری تعلق پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ طے کریگا کہ اس کائنات کو اور انسان کو آخر کس مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ مقصد کا تعیّن کر لینے کے بعد ہی کائنات اور انسان کے باہمی تعلق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کائنات مادہ کے اندھے بہرے لزوم کا ایک تماشہ ہے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ ایک بے منصوبہ اور بے مقصد عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہوئی۔ بے ترتیب، منتشر اور غیر مربوط مظاہر کائنات نے آخر یہ کیونکر گوارا کیا کہ وہ اپنی آزادی بلکہ آوارگی کو ترک کر کے قانون یکسانیت کی غلامی اختیار کر لیں۔

قدرت کے یہ سارے کرشمے زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں انہیں بغیر کسی منصوبہ اور مقصد کے تخلیق نہیں کیا گیا بلکہ وہ قدرت کے ایک عظیم منشا کو پورا کرنے کے لیے معرضِ وجود میں لائے گئے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اُن کے اندر اس حیرت انگیز نظم و ربط کی بجائے زبردست انتشار اور اختلال ہوتا۔ سائنس دانوں نے جو قدرت کے ان کرشموں کے درمیان علّت و معلول کے رشتے تلاش کیئے ہیں وہ خود اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انہیں ایک خاص مقصد کے تحت ایک دوسرے سے منسلک کیا گیا ہے۔ علّت و معلول کا رشتہ بذاتِ خود مقصد

اور منصوبہ بندی کی غمازی کرتا ہے۔

یہ ہے وہ فکری انتشار جو تخلیق کائنات کے بے مقصد ہونے کے بارے میں مادہ پرستوں کے اندر پایا جاتا ہے۔

پھر تخلیقِ انسان کو بے مقصد قرار دے کر سائنس دانوں نے اور بھی زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ انسان بھی کائنات کے دوسرے مظاہر کی طرح ایک ایسی بے مقصد مخلوق ہے جو بے شعور مادہ کے ہاتھ میں ہر آن ایک کھلونے کی طرح کھیلنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے تو پھر انسان کے کسی فعل پر نیک و بد یا محمود و مذموم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ جو عمل بالکل میکانکی طور پر اندھے بہرے لزوم کی کارفرمائی سے واقع ہو اسے کبھی اچھا اور برا نہیں کہا جا سکتا۔ اس استدلال کی بنا پر ہر قسم کے معاشرتی مظالم، سیاسی جبر اور معاشی استحصال کو جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ انسان بے بسی کے عالم میں کرتا ہے۔

انسانی اعمال میں خیر و شر کی تمیز صرف مقصد ہی سے پیدا ہوتی ہے اگر تخلیق کا کوئی مقصد نہ ہو تو نیکی کو بدی سے، شرافت کو رذالت سے ممیز اور ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے انسان اپنے اعمال کا صرف اسی صورت میں ذمہ دار ہو سکتا ہے جب ہم یہ تسلیم کریں کہ وہ مادہ کے ہاتھ میں مجبورِ محض نہیں بلکہ اپنا ارادہ اور اختیار رکھتا ہے۔ اس کے اندر اخذ و ترک کی قوت اور صلاحیت موجود ہے۔ وہ اپنی مرضی سے ایک طرزِ عمل کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مقصد اور اختیار ہی دو ایسی بنیادیں ہیں جن پر انسان کا سارا اخلاقی، معاشرتی اور روحانی نظام قائم ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حیات انسانی کے لئے یہ دو بنیادیں جتنی اہم ہیں اتنا ہی سائنس ان سے بے تعلق ہے۔ صحیح بات ہے کہ سائنس اپنے مزاج کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ ان کے متعلق کسی قسم کی لب کشائی کی جسارت نہ کرے۔ بہت سے ایسے سائنس دان جو علوم طبعی کے فطری حدود سے واقف ہیں انہوں نے ہمیشہ ان حدود کا احترام کیا اور جب بھی سائنس نے کسی زعم

باطل میں گرفتار ہوکر ان فطری حد بندیوں سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ اس کے راستے میں مزاحم ہوئے۔ لیکن سائنس پر ایمان رکھنے والوں میں ایسے نادان پرستاروں کی کمی نہیں جنہوں نے پندار اور ضد میں آکر اس بیچاری کو ایسے کوچوں میں گھسیٹنا شروع کیا جہاں اس کا گذر بالکل ناممکن ہے اور اس طرح اسے ذلیل اور رسوا کیا۔ اس کا گلا گھونٹ کر اس سے اُن سوالات کے جوابات اُگلوانے کی کوشش کی جو کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتے تھے۔ پروفیسر اڈنگٹن نے کسی قدر صحیح کہا ہے:

"ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ علوم طبعی نے جس چیز کی تلاش و جستجو کی ہے وہ حقیقت کا محض ایک پہلو ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دوسرے پہلوؤں کا کس طرح ادراک کیا جائے۔ حقیقت کے دوسرے گوشوں کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کا حیاتِ انسانی سے موجوداتِ طبعی کی بہ نسبت کم تعلق ہے۔ ہمارے احساسات، ہمارے مقاصد اور ہماری قدریں ہمارے شعور کا ویسا ہی جزو لاینفک ہیں جیسے حسی تاثرات جن کی رہنمائی میں ہم نے عالمِ محسوسات کی بادیہ پیمائی کی۔ لیکن جب ہم اپنی شخصیت کے محرکات کے تحت قدم بڑھاتے ہیں تو ہمیں اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے قدم ہمیں زمان و مکان کی محدود دنیا کی بجائے کسی دوسرے عالم کی طرف ہی لے جارہے ہیں۔

رسائل ومسائل

چند جدید ملحدانہ نظریات کا علمی جائزہ

سوال ۔ میرے ایک عزیز جو ایک اونچے سرکاری منصب پر فائز ہیں، کسی زمانے میں پکّے دیندار اور پابند صوم وصلوٰۃ ہُوا کرتے تھے، لیکن اب کچھ کتابیں پڑھ کر لامذہب ہو گئے ہیں۔ ان کے نظریات یکسر بدل چکے ہیں۔ ان نظریات کی تبلیغ سے بھی وہ باز نہیں آتے۔ میں ان کے مقابل میں اسلامی احکام وتعلیمات کی مدافعت کی پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن اپنی کم علمی کی وجہ سے ان کا مدلّل جواب دینا میرے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے آپ سے گذارش ہے میری مدد فرمائیں۔ ان کے موٹے موٹے نظریات درج ذیل ہیں:

۱۔ خدا کو وہ قادرِ مطلق اور اس جہان کا پیدا کرنے والا تو مانتے ہیں مگر ان کے نزدیک جہان کو خدا نے بنا کر چھوڑ دیا ہے، اور اب یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے آپ سے آپ (AUTOMATIC) ہو رہا ہے۔

۲۔ رسولؐ کو وہ ایک مصلح (ریفارمر) سے زیادہ درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ البتہ انہیں وہ نیک اور غیر معمولی قابلیت کا انسان بھی سمجھتے ہیں۔

۳۔ قرآن شریف کو وہ (معاذاللہ) رسول خدا کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اسکی بہت سی باتوں کو اس وجہ سے ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں کہ وہ صرف اُس وقت کے لیے تھیں، جب قرآن نازل ہُوا۔

۴۔ عبادات، نماز، روزہ وغیرہ کو صرف بُرائی سے بچنے کا بہترین ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ سمجھتے ہیں۔

۵۔ نظریۂ شیطان ان کے خیال میں خدا کے واسطے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خدا تو نیکی کی توفیق دیتا ہے اور شیطان برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ اور بظاہر تو عام طور پر شیطان کی جیت ہوتی ہے۔

۶۔ چار شادیوں، غلام رکھنے اور قربانی کو لغو قرار دیتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ کچھ وقت نکال کر ان باتوں کا مختصر جواب دیں گے اور ان کتابوں کے نام جہاں سے میں ان کی تسلی کر سکوں درج فرما کر ممنون کریں گے۔

جواب

مجھے آپ کے عزیز عہدے دار کے خیالات معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے، اور آپ کو ان کے اثر سے محفوظ رکھے۔ اگر آپ نے میری کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو آپ ان کی سب باتوں کا جواب بڑی اچھی طرح دے سکتے تھے۔ اب بھی میں آپ کو مطالعہ کر کے تیار رہنے کا مشورہ دوں گا۔ کیونکہ خط و کتابت میں اتنے بڑے بڑے مسائل کو سمجھانا بڑا مشکل ہے۔

مختصراً میں ان باتوں کا جواب دیتا ہوں جو آپ نے پوچھی ہیں:

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جس شخص کی قوتِ فکر ماؤف نہ ہو وہ کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی قانون اور نظم (LAW AND ORDER) کسی نافذ کرنے والے اقتدار (AUTHORITY) کے بغیر بھی نافذ ہو سکتا اور جاری رہ سکتا ہے۔ کائنات میں قانون اور نظم موجود ہے، اس کا انکار تو کسی طرح کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے۔ کہ اتنے بڑے لامحدود پیمانے پر لامحدود مدت تک یہ قانون اور نظم کسی اقتدار کے بغیر ہی چل رہا ہے؟ کوئی غیر متعصب عقل تو اسے باور نہیں کر سکتی۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اچھے خاصے ہوشمند انسان اس نادانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی فکر و نظر کا ظرف بہت تنگ ہے جس کے باعث وہ اس عظیم الشان اقتدار کا تصور کرنے سے عاجز رہ جاتے ہیں جو اتنی بڑی کائنات میں نظم اور قانون کو ازل سے

ابد تک چلا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس کو ماننا چاہتے ہی نہیں ہیں، کیونکہ اس کو مان لینے کے بعد ان کے لیے دنیا میں من مانی کرنے کی آزادی باقی نہیں رہتی۔

یہ تو خدا کے متعلق ان کے تصور کی غلطی ہے۔ لیکن جو حضرات اس طرح کی باتیں کرتے ہیں ان سے عرض کیجیے کہ اتنے بڑے بڑے مسائل پر سوچنے اور اظہار رائے کرنے والے آدمیوں کو کم از کم ایماندار (HONEST) تو ہونا چاہیے۔ آپ لوگ اس صفت سے بھی خالی ہیں۔ آپ خدا اور رسول اور قرآن کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں وہ اسلام کے بالکل خلاف ہیں، مگر اس کے باوجود آپ مسلمان بنے پھرتے ہیں اور مسلم معاشرے کو دھوکا دینے میں آپ کوئی تامل نہیں کرتے۔ اگر آپ ایماندار ہوتے تو جس وقت آپ نے یہ آراء قایم کی تھیں اسی وقت اسلام سے اپنی علاحدگی کا اعلان کر دیتے اور اپنے نام بھی تبدیل کر لیتے تاکہ مسلم معاشرہ آپ سے دھوکا کھا کر آپ کے ساتھ اپنے وہ معاملات جاری نہ رکھتا جو وہ کسی غیر مسلم کے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس صریح جعل سازی اور فریب کے بعد آپ کی کسی رائے کو وہ وقعت دینا جو صرف ایماندار اور مخلص آدمیوں کی آراء ہی کو دی جا سکتی ہے، ہمارے لیے سخت مشکل ہے۔

(۲) رسول کے بارے میں ان کے خیالات متضاد ہیں۔ ایک طرف وہ رسول کو نیک آدمی بھی کہتے ہیں، جس سے لازم آتا ہے کہ وہ اس کو سچا آدمی بھی مانیں (الا یہ کہ ان کے نزدیک کوئی جھوٹا آدمی بھی نیک ہو سکتا ہو) اور دوسری طرف وہ رسول کے اس دعوے کو جھوٹا بھی قرار دیتے ہیں کہ وہ محض ریفارمر نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ایک صحیح العقل آدمی ان دونوں باتوں کو جمع نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس ۲۳ سال تک اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے مخالفین کے مقابلہ میں ایک ایسی جدوجہد (STRUGGLE) کرتے ہوئے گزارا ہے جس کی بنیاد ہی یہ تھی کہ آپ اپنی رسالت کے مدعی تھے اور آپ کے مخالفین اسی بات کو نہ ماننا چاہتے تھے۔ اب ایک شخص کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دو ہی رویے اختیار کرنا معقول ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر وہ ان کو سچا آدمی سمجھتا ہے تو ان کو رسول مانے۔ دوسرے یہ کہ وہ اگر ان کو رسول نہیں مانتا تو معاذ اللہ انہیں بدترین جھوٹ اور فریب کا مرتکب خیال کرے۔

ان دونوں باتوں کے درمیان ایک تیسری راہ اختیار کرنا اور کہنا کہ وہ سچے آدمی بھی تھے اور رسول بھی نہ تھے، سراسر غیر معقول بات ہے۔

اس کے جواب میں ایسے لوگوں کی جانب سے زیادہ سے زیادہ دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اصلاح کی خاطر رسالت کا دعویٰ کر دیا تاکہ وہ خدا کے نام سے وہ احکام تسلیم کرا سکیں جو وہ اپنے نام سے پیش کر کے نہ منوا سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے اس دعوے میں مخلص تو تھے مگر حقیقت میں رسول نہ تھے بلکہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ رسول ہیں۔

ان میں سے پہلی بات جو شخص کہتا ہے وہ میرے نزدیک اخلاقی حیثیت سے بڑا خطرناک آدمی ہے جس سے ہر شریف انسان کو ہوشیار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ہم اس کے اس خیال کا تجزیہ کریں تو صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک نیک مقصد کے لیے بُرا طریق کار اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ قابلِ وقعت (RESPECTABLE) بھی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ایسے آدمی کو مصلح اور نیک آدمی سمجھتا ہے جس نے اس کے خیال میں محض اصلاح کرنے کے لیے (نعوذ باللہ) دعوائے رسالت جیسا عظیم الشان فریب گھڑ لیا تھا۔ اس طرح کے گھٹیا نظریات رکھنے والے آدمی سے کچھ بعید نہیں ہے کہ کل وہ کسی اچھے مقصد کے لیے (جس کو وہ اچھا سمجھتا ہو) کسی کے ہاں چوری کر ڈالے، یا کوئی جعلی دستاویز بنالے، یا اور کسی گھناؤنے اخلاقی جُرم کا مرتکب ہو جائے۔ کیونکہ جب اس کے نزدیک ایک فریبی اس بناء پر نیک اور مصلح ہو سکتا ہے کہ اس نے اصلاح کے لیے فریب کاری کی ہے، تو آخر وہ خود اچھے مقاصد کے لیے جرائم کرنے سے کب باز رہ سکتا ہے۔

دوسری بات جو شخص کہتا ہے وہ عقلی حیثیت سے اتنا ہی پست ہے جتنا اوپر والی بات کہنے والا اخلاقی حیثیت سے پست ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت (ALLOWANCE) دیتے ہوئے ایسے شخص کے متعلق جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ شخص بہت بڑے مسائل پر بہت کم سوچ کر اظہارِ رائے کر دینے کا مریض ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ اس کم عقلی میں مبتلا نہ ہوتا تو کبھی اس بات کو ممکن خیال نہ کرتا کہ ایک شخص اتنا عقیل و فہیم بھی ہو کہ اسے تاریخ انسانی کے بلند ترین اور کامیاب ترین لیڈروں میں

شمار کرنے سے اس کے مخالفین بھی انکار نہ کر سکیں، اور دوسری طرف وہ اپنے بارے میں ۲۳ سال تک مسلسل اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہے اور اپنا سارا کام اسی غلط فہمی کی بنیاد پر چلاتا رہے، بلکہ آئے دن قرآن کی پوری پوری سورتیں خود تصنیف کر کر کے دنیا کو سناتا رہے اور پھر بھی وہ اس غلط فہمی میں پڑا ہوا ہو کہ یہ سورتیں میرے اوپر خدا کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں۔ میرے نزدیک تو اس بات کو ممکن اور معقول سمجھنے والے آدمی کی اپنی عقل ہی مشتبہ ہے۔ اس کی عقل درست ہوتی تو وہ خود جان لیتا کہ اس طرح کی غلط فہمی صرف مجنون آدمیوں کو لاحق ہوا کرتی ہے، اور کسی مجنون آدمی سے وہ کمال درجہ کے مدبرانہ اور حکیمانہ کارنامے صادر نہیں ہو سکتے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئے ہیں۔

(۳) قرآن کے متعلق ان کے جو خیالات آپ نے نقل کیے ہیں ان کے بارے میں بھی میری وہی رائے ہے جو میں نے اوپر عرض کی ہے کہ وہ کسی چیز سے پوری واقفیت بہم پہنچائے بغیر اور اس پر کافی غور کیے بغیر رائے قایم کرنے کے خوگر ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ آپ نے ساری عمر میں کتنی دفعہ قرآن کا گہرا تحقیقی مطالعہ فرمایا ہے جس کے بعد آپ اس کے بارے میں یہ فیصلہ دینے کے قابل ہوئے ہیں۔ اگر وہ ایمانداری کے ساتھ یہ تسلیم فرمالیں کہ انہوں نے اس طرح کا تحقیقی مطالعہ نہیں کیا ہے، تو ان سے گزارش کیجیے کہ تحقیق کے بغیر ایسے اہم مسائل میں فیصلے صادر کرنا کسی ذی ہوش اور تعلیم یافتہ آدمی کے شایان شان نہیں ہے۔ اور اگر ان کا دعویٰ یہ ہو کہ انہوں نے خوب تحقیق کر کے یہ رائے قایم کی ہے تو ان سے دریافت کیجیے کہ قرآن کے اندر انہوں نے وہ کون سی شہادت پائی ہے جسے دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ نیز یہ بھی دریافت کیجیے کہ قرآن کی کن کن باتوں کو انہوں نے ناقابلِ عمل، یا زمانۂ نزول قرآن تک کے لیے قابلِ عمل پایا ہے۔ ان امور کی تعیین ان سے کرا لیجیے اور پھر مجھے لکھیے تاکہ میں بھی کچھ ان کے نتائج تحقیق سے استفادہ کر سکوں۔

(۴) عبادات کے بارے میں ان کے جو نظریات آپ نے بیان کیے ہیں وہ بھی سخت ژولیدہ فکری (CONFUSED THINKING) بلکہ بے فکری کا نمونہ ہیں۔ شاید انہوں نے کبھی

اس بات پر غور نہیں کیا کہ نماز روزہ وغیرہ اعمال صرف اسی صورت میں بُرائی سے بچنے کا بہترین ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ ہو سکتے ہیں جبکہ انہیں خلوص کے ساتھ کیا جائے، اور خلوص کے ساتھ آدمی ان پر اسی صورت میں کاربند ہو سکتا ہے جب وہ ایمانداری سے یہ سمجھتا ہو کہ خدا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول تھے اور کوئی آخرت آنے والی ہے جس میں مجھے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان سب باتوں کو خلاف واقعہ سمجھتا ہو، اور یہ خیال کرتا ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اصلاح کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی یہ عبادات بُرائی سے بچنے کا ذریعہ اور معاشرے کو صحیح ڈگر پر چلانے کا آلہ بن سکیں گی۔ ایک طرف ان عبادات کے یہ فوائد بیان کرنا اور دوسری طرف ان فکری بنیادوں کو خود ڈھا دینا جن پر ان عبادات کے یہ فوائد منحصر ہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کارتوس سے سارا گن پاؤڈر نکال دیں اور پھر کہیں کہ یہ کارتوس شیر کے شکار میں بہت کارگر ہے۔

(۵) شیطان کے مسئلے پر ان کا اعتراض دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی پوری عمر میں کبھی ایک مرتبہ بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں فرمائی کہ قرآن مجید انسان اور شیطان کے معاملے کی کیا حقیقت بیان کرتا ہے۔ اس کو جانے بغیر انہوں نے محض کچھ سُنی سنائی باتوں کی بنیاد پر اس مسئلے کا سطحی سا تصوّر قائم کر لیا اور اس پر اعتراض جڑ دیا۔ یہ اعتراض درحقیقت ان کے اپنے ہی تصوّر پر وارد ہوتا ہے۔ اس تصوّر پر اس کی کوئی زد نہیں پڑتی جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ قرآن کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ خدا نے انسان کو ایک محدود نوعیت کی آزادی و خود مختاری دے کر اس دُنیا میں امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور شیطان کو خود اس کے اپنے مطالبے پر یہ آزادی عطا کی ہے کہ وہ اس امتحان میں انسان کو ناکام کرنے کے لیے جو کوشش کرنا چاہے کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ صرف ترغیب و تحریص کی حد تک ہو۔ زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جانے کے اختیارات اسے نہیں دیئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالٰے نے خود بھی انسان کو جبراً راہِ راست پر چلانے سے احتراز فرمایا ہے، اور صرف اس

بات پر اکتفا فرمائی ہے کہ انسان کے سامنے انبیاء اور کتابوں کے ذریعہ سے راہِ راست کو پوری طرح واضح کر دیا جائے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے آدمی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو خدا کی پیش کردہ راہ کو اپنے لیے چن لے اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرے، اور چاہے تو شیطان کی ترغیبات قبول کرلے اور اس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنے پر آمادہ ہو جائے جو شیطان اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان دونوں راہوں میں سے جس کو بھی انسان خود اپنے لیے انتخاب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی پر چلنے کے مواقع اسے دے دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر امتحان کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ اس پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد بتائیے کہ شیطان کا چیلنج دراصل کس کے لیے ہے؟ خدا کے لیے یا انسان کے لیے؟ اور انسانوں میں سے جو لوگ شیطان کی راہ پر جاتے ہیں اُن کے معاملہ میں شیطان کی جیت خدا پر ہوتی ہے یا انسان پر؟ خدا نے تو آدمی اور شیطان کو آزادانہ کشتی لڑنے کا موقع دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ آدمی جیتے گا تو جنّت میں جائے گا، اور شیطان جیتے گا تو ہارنے والا آدمی اور اس کو غلط راہ پر لے جانے والا شیطان دونوں جہنّم میں جائیں گے۔ اب کیا آپ چاہتے ہیں کہ خدا اس کے مقابلے میں مداخلت کر کے زبردستی انسان کو کامیاب کرائے؟

(۶) چار شادیوں اور غلامی اور قربانی کے بارے میں مختصر طریقے سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں ان جملہ مسائل پر متعدد مرتبہ تفصیلاً اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ تعددِ ازواج کے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے آپ میری تفسیر تفہیم القرآن حصّہ اوّل کے متعلقہ مقامات انڈکس کی مدد سے (نکاح۔ قانونِ اسلامی۔ ازدواجی زندگی کے تحت) مطالعہ کریں۔ علاوہ ازیں حکومت کے مقرر کردہ میرج کمیشن کے سوالنامے کا جو جواب میں نے دیا تھا اس میں بھی اس مسئلے پر بحث موجود ہے۔

غلامی کے مسئلے پر آپ میرے درج ذیل مضامین مطالعہ فرمائیں:

۱۔ رسائل و مسائل حصّہ اوّل مضمون "میدانِ جنگ میں قیدی"

۲۔ " " دوم " "اسلام میں غلامی کو ممنوع کیوں نہ کر دیا گیا؟"

۳۔ تفہیمات حصہ دوم مضمون "غلامی کا مسئلہ" نیز "غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق چند سوالات"

۴۔ تفہیم القرآن حصہ اوّل و دوم۔ انڈکس میں "غلامی" کے زیر عنوان صفحات کا حوالہ موجود ہے

۵۔ ماہنامہ "ترجمان القرآن" شمارہ جون ۵۶ء "کنیز کی تعریف اور اس کے حلال ہونے کی دلیل، تعدد ازواج اور لونڈیاں"۔

قربانی کے متعلق آپ میری کتاب تفہیمات حصہ دوم میں قربانی کے متعلق مضامین، نیز میرا رسالہ "مسئلہ قربانی" مطالعہ فرمائیں۔

ان ساری تحریروں سے انشاء اللہ آپ کو افہام و تفہیم میں مزید مدد ملے گی۔

پاکستان میں مسیحیت کی ترقی کے اصل وجوہ

سوال۔ اس ملک کے اندر مختلف قسم کے فتنے اُٹھ رہے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک فتنہ عیسائیت ہے۔ اس لیے کہ بین المملکتی معاہدات کے علاوہ عام مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے اس فتنہ سے جو خطرہ لاحق ہے وہ ہرگز کسی دوسرے فتنہ سے نہیں۔

اندریں حالات جبکہ اس عظیم فتنے کے سدِّ باب کے لیے تمام تر صلاحیت سے کام لینا از حد ضروری تھا۔ ابھی تک جناب کی طرف سے کوئی مؤثر کارروائی دکھائی نہیں دیتی بلکہ آپ اس فتنہ سے مکمل طور پر صرفِ نظر کر چکے ہیں۔ ابھی تک اس طویل خاموشی سے میں یہ نتیجہ اخذ کر چکا ہوں کہ آپ کے نزدیک مسیحی مشن کی موجودہ سرگرمی مذہبی اعتبار سے قابلِ گرفت نہیں۔ اور اس فتنہ کو اس ملک کے اندر تبلیغی سرگرمی کا حق حاصل ہے خواہ مسلمانوں کے ارتداد سے حادثہ عظمٰی کیونکر ہی پیش نہ ہو۔ مہربانی فرما کر بندہ کی اس خلش کو دور کریں۔

سعد الدین مردان (حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

جواب۔ جن فتنوں کے پھیلنے کا زیادہ تر انحصار نشر و تبلیغ پر ہو ان کا مقابلہ تو بے شک نشر و

تبلیغ سے کیا جا سکتا ہے اور اس کام میں دانستہ کوتاہی میں نے کبھی نہیں کی ہے۔ لیکن جن فتنوں کو پھیلانے میں اختیارات کی طاقت کارفرما ہو ان کے علاج کی کوئی صورت اس طاقت کی اصلاح یا تبدیلی کے سوا نہیں ہے۔ ان کو محض نشر و تبلیغ سے نہیں روکا جا سکتا۔

عیسائیت کے معاملہ میں یہی صورت پیش آرہی ہے جیسا کہ آپ نے خود بھی اپنے خط میں اعتراف کیا ہے۔ جو لوگ اس ملک میں عیسائیت قبول کر رہے ہیں یا پہلے جنہوں نے قبول کی ہے، ان میں بہت ہی کم ایسے ہونگے جنہوں نے دلیل کی بنا پر یہ مان لیا ہو کہ خدا تین ہیں، یا حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے، یا ایک شخص کا سولی پر چڑھ جانا دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے عقائد کو صحیح مان کر، اور اسلام کے معقول عقائد کو غلط سمجھ کر مسلمان سے عیسائی بن جانے والے آخر کتنے ہو سکتے ہیں۔ دراصل جو چیز لوگوں کو عیسائیت کی آغوش میں کھینچے لیے جا رہی ہے وہ مسیحی مشنریوں کی تبلیغ نہیں بلکہ مشن ہسپتالوں، اسکولوں کی کارگزاری ہے جسے فروغ دینے میں ہماری اپنی حکومت کی بالواسطہ اور بلاواسطہ امداد کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس پر مزید وہ غیر معمولی اثر و رسوخ ہے جو عیسائی پادریوں کو ہمارے حکام عالی مقام کی بارگاہوں میں حاصل ہے۔ یہ بھی عیسائیت کے پھیلنے میں مددگار ہو رہا ہے۔ ان اسباب کی جب تک روک تھام نہ ہو، میری، آپ کی، یا تمام علماء کی مجموعی تبلیغ سے بھی کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

عیسائی ہسپتالوں میں ہر شخص جا کر خود دیکھ سکتا ہے کہ نہ وہ بے غرض خدمتِ خلق کے ادارے ہیں، اور نہ علاج کے تجارتی ادارے، بلکہ ان میں کھلم کھلا ایمان خریدنے کا کاروبار ہو رہا ہے۔ ان اداروں میں مسلمانوں سے علاج کی خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ دینِ مسیحی کی تبلیغ بھی مریضوں پر کی جاتی ہے۔ اس حالت میں ایک غریب

ؑ (حاشیہ صفحہ سابق) یہاں خلاف معمول سائل کا نام و مقام محض اس وجہ سے دیا جا رہا ہے کہ وہ بالعموم اپنے خطوط میں مکمل پتہ نہیں لکھتے اس لیے انہیں براہ راست جواب سے مطلع کرنا محال ہوتا ہے۔ اگر وہ ترجمان کے باقاعدہ قارئین میں سے ہیں تو فبہا، ورنہ قارئین میں سے جو انھیں جانتے ہوں، جواب سے انھیں مطلع فرمادیں۔

آدمی کے لیے، جو اپنا یا اپنے کسی عزیز کا علاج کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اس امر کی بہت بڑی تحریص موجود ہے کہ وہ اپنا دین تبدیل کر کے علاج کی سہولتیں حاصل کر لے۔

مسیحی مدرسوں اور کالجوں میں بھی یہی صورت ہے کہ ان میں مسلمانوں سے خوب فیسیں لی جاتی ہیں اور عیسائیوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے، بلکہ ان کے لیے بیرونی ممالک میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کر دی جاتی ہیں۔ یہاں پھر غریبوں کے لیے یہ تحریص موجود ہے کہ جو تعلیم وہ اپنے بچوں کو خود نہیں دلا سکتے، اس کا انتظام محض مذہب تبدیل کرنے سے ہو سکتا ہے اور دنیوی ترقی کے دروازے ان کے لیے کھل سکتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے ادارے ہمارے ملک میں ایک طرف تو بیرونی روپے سے چل رہے ہیں، اور دوسری طرف ہماری اپنی حکومت ہر طرح ان کی امداد کر رہی ہے۔ ان کو گرانٹ دی جاتی ہے۔ ان کو زمینیں دی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ وہ رعایتیں کی جاتی ہیں جو خود مسلمانوں کے مذہبی اداروں کے ساتھ کبھی نہیں کی گئیں۔ اور ان کے معاملہ میں اس سوال سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئی ہیں کہ باہر سے آنے والا یہ روپیہ جو ان اداروں پر خرچ ہو رہا ہے اور غیر ممالک کے مشنری ہمارے شہروں اور دیہات میں پھیل کر اس روپے سے جو کام لے رہے ہیں، اس کے پیچھے خالص دینی تبلیغ کے علاوہ اور کیا اغراض کار فرما ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے اپنے ہی حکمران مذہبی رواداری کے تمام معقول حدود سے تجاوز کر کے اس بات پر نہ صرف راضی ہیں بلکہ اس میں خود مددگار بن رہے ہیں کہ دوسرے لوگ روپے کے زور سے مسلمانوں کے ایمان خرید لیں۔

مسیحی پادریوں کے اثر و رسوخ کا یہ حال ہے کہ آج ہمارے دیہاتی علاقوں میں غیر مسیحی عوام کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لیے کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے، لیکن ہر جگہ مسیحی برادری کا پشت پناہ ایک پادری موجود ہے جو تھانے سے لے کر سکرٹری ایٹ تک ہر درجے اور مرتبے کے حکام سے مسیحیوں کو نہ صرف انصاف دلواتا ہے بلکہ ان کے لیے بے جا رعایتیں تک حاصل

کر لیتا ہے۔ مسلمانوں کے کسی عالم کو ان حاکموں کی بارگاہوں میں وہ رسائی حاصل نہیں ہے جو عیسائی پادریوں کو حاصل ہے۔ مسلمان علماء ان حکام کی نگاہوں میں ویسے ہی ذلیل و خوار ہیں جیسے انگریز حاکموں کی نگاہ میں کبھی تھے۔ مگر مسیحی پادری ان کا بھی اسی طرح "فادر" ہے جس طرح انگریز حاکموں کا تھا۔ یہ ایک اور سبب ہے جس کی بنا پر دیہات کے بے سہارا لوگ اپنے آپ کو پولیس اور زمینداروں اور با اثر غنڈوں کے ظلم سے بچانے کے لیے مسیحیت میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

یہ تو غریبوں میں مسیحیت کے پھیلنے کے اسباب ہیں۔ رہے کھاتے پیتے طبقے، تو ہماری حکومت ہی کی پالیسی کا یہ نتیجہ ہے کہ خوش حال لوگ اپنی اولاد کو اردو زبان اور اپنی قومی تہذیب اور اپنے دین کی تعلیم و تربیت دینا لاحاصل سمجھتے ہیں اور ان کو ایسی تعلیم و تربیت دلوانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ زبان اور اطوار و عادات کے اعتبار سے پورے انگریز یا امریکی بن جائیں۔ اس غرض کے لیے وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو مسیحی اداروں میں بھیجتے ہیں جہاں کا پورا ماحول انھیں اسلام اور اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی تعلیمات سے محض ناواقف ہی نہیں بلکہ منحرف اور باغی بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر یہ نوجوان عیسائی نہ بھی بنیں تو بہرحال مسلمان تو نہیں رہتے۔ بلکہ مسلمانوں کی بہ نسبت عیسائیوں سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ تعلیم سے فارغ ہو کر ہمارے بڑے بڑے افسر بنتے ہیں اور اونچے عہدے انھی کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ ان سے کون یہ اُمید کر سکتا ہے کہ ان کی ہمدردیاں مسیحیت کے مقابلے میں کبھی اسلام کے ساتھ ہو سکیں گی اور مسیحیت کے فروغ کو روکنے کا کوئی جذبہ ان میں پیدا ہو سکے گا۔

اِن حالات میں آپ خود بتایئے کہ محض مسیحی عقاید کی تردید میں مضامین لکھنے یا گاؤں گاؤں تبلیغ کے لیے دورے کرنے سے مسیحیت کے اس سیلاب کو کہاں تک روکا جا سکتا ہے۔

مطبُوعات

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (بزبانِ انگریزی)

تالیف: جناب حامد علی صاحب
شائع کردہ: پاکستان سنڈیکیٹ - ۲۱۲ سٹفورڈ روڈ ڈھاکہ - مشرقی پاکستان

قیمت: ساڑھے سات روپے - صفحات: ۳۹۱

زیر تبصرہ کتاب میں یوں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی کے نقوش اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اس کتاب کا زیادہ تر حصّہ اُن کے عہد کی فتوحات پر مشتمل ہے۔ مصنّف کی محنت قابلِ قدر ہے۔ لیکن اس میں چند باتیں ایسی ہیں جو ذہن میں خلش پیدا کرتی ہیں۔ فاضل مصنّف نے آخری نوٹ میں "جہاد" پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اسلام کی مقدس اور پاک تعلیم کے مطابق اسلام کے ابتدائی دَور میں مسلمانوں نے جتنی جنگیں بھی لڑیں اُن کی نوعیّت سراسر مدافعانہ تھی۔ یہ ایک ایسا دعوٰے ہے جو اپنے پیچھے کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ مسلمان مدافعت کے لئے بھی سربکف ہوئے اور اُنہوں نے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے بھی ہتھیار اُٹھائے۔ اُنھوں نے خود آگے بڑھ کر دنیا سے ظلم وستم اور جور و جفا کو مٹانے کی کوشش کی۔ اس لیئے جو لوگ "جہاد" کو محض ایک مدافعانہ جنگ کہہ کر اہلِ مغرب کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ یہ ایک ایسا معذرت خواہانہ طرزِ فکر ہے جو اسلام کی تبلیغ کے لیے کچھ مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مزید اُلجھنیں پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

پھر ہمیں مصنّف کے اس دعوے پر سخت حیرت ہوتی ہے جس کے مطابق اُنھوں نے چوہدری ظفر اللہ خاں کو اسلامی تاریخ کا ایک بے مثال عالم قرار دیا ہے۔ مصنّف اگر چوہدری

صاحب کے لیے دل میں کوئی جذبہ احترام رکھتے ہیں تو اس کے اظہار کی کوئی دوسری صورت نکال لیتے لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ ایک طرف اپنے آپ کو ایک مؤرخ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں، اور دوسری طرف اُنہوں نے یہ ایک ایسی خلاف واقعہ بات کی ہے جس پر خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے اور خود اُن کی علمی ثقاہت کے بارے میں ہی ذہن میں کئی قسم کے خیالات آنا شروع ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی تصنیف میں وہ توازن نہیں ملتا جو ایک تاریخی دستاویز کی جان ہے۔

طوفان سے ساحل تک

تالیف: جناب محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ ویس)
ترجمہ: مولانا محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی"

شائع کردہ: مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام۔ لکھنؤ

قیمت: پانچ روپے۔ صفحات: ۲۸۷

مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام دین کی نشر و اشاعت کے لیے جو مفید اور کارآمد لٹریچر شائع کر رہی ہے زیر تبصرہ کتاب اُسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ درحقیقت مشہور جرمن فاضل، جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی نعمت سے نوازا ہے، کے احساسات و تاثرات کا اُردو ترجمہ ہے۔ جناب اسد صاحب کو اپنے آغازِ شباب میں مسلمان ملکوں میں گھومنے پھرنے کا موقع نصیب ہوا۔ اور اُنھوں نے مسلمانوں اور اہلِ یورپ کی ذہنی ساخت اور نفسی کیفیات کے درمیان جو بنیادی فرق ہے، اُسے سمجھنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے یہ محسوس کیا کہ یورپ میں لوگ سائنس کی ترقی، مال و متاع کی فراوانی کے باوجود داخلی زندگی میں کرب محسوس کرتے ہیں، اُن کے ذہنوں میں ایک خوفناک قسم کی کش مکش موجود ہے۔ اُن کے دل بجھے بجھے سے ہیں اور وہ "سکون" کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اُن کے مقابلے میں مسلمان مالی اعتبار سے پس ماندہ اور خستہ حال ہیں، لیکن اُن کے دل و دماغ میں اس طرح کی کوئی پریشانی نہیں جو زندگی کے توازن کو بگاڑ کر رکھ دے۔ مسلمانوں کی زندگی کے اسی امتیاز نے انہیں اسلام کے قریب کیا۔

"روڈ ٹو مکہ" پر مکمل تبصرہ ہم "ترجمان القرآن" میں شاہراہِ مکہ کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔

یہ تلخیص و ترجمہ (طوفان سے ساحل تک) بڑا عمدہ اور معیاری ہے اور انشاء اللہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کے فاضلانہ اور فکر و احساس کو بیدار کرنے والے پیش لفظ نے اس کتاب کی افادیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

مطالعہ تہذیبِ اسلامی

مصنفہ: جناب پروفیسر محمد ارشاد خاں بھٹی ایم۔اے، ایم ایس سی
صدر شعبہ علوم اسلامیہ ایم۔اے۔او کالج لاہور

ناشر: بک ورلڈ۔ خانم بازار۔ انارکلی۔ لاہور

قیمت: چار روپے۔

تعلیمی کمیشن کی رپورٹ سے نصاب میں بعض مفید تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ خصوصاً اسلامی تعلیمات کے بعض ایسے حصّے نصاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں جن سے اگر صحیح طریق سے کام لیا جائے تو نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں کو دور کرنے اور اُن کے دل و دماغ میں اسلام کی عظمت اور برتری بٹھانے میں کافی حد تک مدد لی جا سکتی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی ایک نہایت اہم اور مفید کڑی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنّف نے سب سے پہلے ان فکری بنیادوں پر بحث کی ہے جن پر اسلامی تہذیب کا رفیع الشان قصر تعمیر کیا گیا ہے۔ پھر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اس تہذیب کی تفصیلات سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ مصنّف کا اندازِ بیان سادہ اور مؤثر ہے۔ اور اُن کے ایک ایک لفظ سے اُن کا خلوص اور اس تہذیب سے اُن کی دلی وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔

یہ کتاب اگرچہ ایف۔اے کے طلباء کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس سے وہ سارے حضرات مستفید ہو سکتے ہیں جو اسلامی تہذیب و تمدّن کو سمجھنے کے آرزومند ہیں۔

تعارف بائبل

تالیف: جناب محمد اسلم رانا بی۔اے (آنرز)، جنرل سیکرٹری مرکزِ تحقیق مسیحیت۔ اچھرہ۔ لاہور۔

قیمت: ۱۲ آنے پیسے

جو لوگ اس ملک میں عیسائیت کی یلغار کو روکنے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں جناب اسلم رانا صاحب اُن میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مفید کتابچہ میں اُنھوں نے مستند حوالوں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ بائیبل کی صحت اور حفاظت خود مسیحی علماء کے نزدیک بھی محلِ نظر ہے۔

سورۂ یٰسٓ مترجم عکسی | شائع کردہ: مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور
ضخامت: بیس صفحات

ھدیہ: قسم اوّل ۱۴ر آنے۔ قسم دوم ۹ر آنے۔

یہ مترجم سورہ چھوٹی تقطیع میں خوش خط، دیدہ زیب اور متعدد رنگوں کے ساتھ بلاک پر طبع ہوا ہے۔ مکتبہ تعمیرِ انسانیت کے پروپرائٹر شیخ محمد قمرالدین صاحب اس طرز طباعت میں خصوصی ذوق اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ جس کا ایک تازہ ثبوت یہ مطبوعہ سورہ ہے۔ شائقین اور قدردان حضرات اُمید ہے اس پیش کش سے کماحقہٗ استفادہ کریں گے۔

صراطِ مستقیم | مصنفہ: جناب سردار محمد اکبر خان صاحب کیمبل پور۔ مغربی پاکستان
نظرثانی: مولانا صدرالدین صاحب راولپنڈی

شائع کردہ: تعمیری کتب خانہ۔ اُردو بازار۔ راولپنڈی

قیمت: ایک روپیہ، ۵ پیسے۔

جناب سردار محمد اکبر خان صاحب ایک صاحبِ فکر اور صاحبِ احساس بزرگ ہیں۔ اور وہ عالمِ شباب ہی سے ہر اُس تحریک کا ساتھ دیتے رہے ہیں جو اسلام کی سربلندی کے لیے جاری کی گئی۔ اُن کے اسی جذبہ نے انہیں مسلمانوں کی بعض اونچی شخصیتوں کے ساتھ وابستہ رکھا۔ زیرِ تبصرہ کتاب دیکھ کر اُن کی زندگی کا دوسرا پہلو یعنی اُن کی تصنیفی قابلیت سامنے آئی ہے۔ اس کتاب میں اُنہوں نے بڑے سادہ انداز میں سورہ فاتحہ، اسلامی توحید کی تشریح اور اُس کے مضمرات، عبد و معبود کا باہمی تعلق، دنیا و آخرت کی فلاح و کامرانی

کے اسلامی اُصولوں پر بحث کی ہے۔

الدّروس العربیّۃ (الجزء الثانی) تالیف: مولانا عبیدالحق صاحب
ناشر: المکتبۃ العلمیۃ۔ ۱۵۔ لیک روڈ۔ لاہور۔

مولانا عبیدالحق صاحب اس ملک میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے جس قسم کی مخلصانہ کوشش کر رہے ہیں وہ یقیناً قابلِ صد ستائش ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اس مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں عربی زبان کے قواعد ذہن نشین کرائے ہیں۔ مصنّف چونکہ اس میدان میں کافی وسیع تجربہ رکھتے ہیں اس لیے اُنہوں نے اپنے اس کام کو بڑے سلیقے اور قرینے کے ساتھ کیا ہے۔

بعض مقامات پر کتابت کی غلطیاں ضرور کھٹکتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۴ پر اِنْضاج کے معنی "پکنا" لکھے گئے ہیں حالانکہ اس کے صحیح معنی پکانا کے ہیں۔

اقامتِ صلوٰۃ تالیف: مولانا عبدالحلیم قاسمی صاحب ناظمِ اعلیٰ جامعہ حنفیہ لاہور
شائع کردہ: شعبہ تبلیغ و اشاعت جامعہ حنفیہ

ھدیہ: مجلّد ایک روپیہ۔ غیر مجلّد بارہ آنے۔

صفحات: ۸۰

اس قابلِ قدر کتابچہ کے فاضل مصنّف دینی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیّت ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں اُنہوں نے اقامتِ صلوٰۃ کی اہمیّت، نماز کے شرائط، فرائض، واجبات، سنن اور دیگر ضروری مسائل کو نہایت آسان اور دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔

ہمارے مُستقل خریداروں میں اپنا نام درج کرائیے!

(اور)

ہماری مطبُوعاتِ خصوصی رعائتی قیمت پر حاصل کیجیے

ہم نے اپنے خریداروں کے فائدے کے لیے طے کیا ہے کہ :-

ایسے تمام حضرات کو جو ہمارے یہاں بحیثیت خریدار درج رجسٹر ہونگے اپنی مطبوعات عام قیمت سے

بیس۲۰ فیصد رعایت دیکر

کم قیمت پر مہیا کریں گے۔ پیکنگ خرچ و محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا

رجسٹر میں اندراج کیواسطے آپکو نہ کوئی فیس دینا ہوگی نہ کوئی مزید چندہ اور نہ ہی آپ اپنی مرضی کیخلاف کوئی کتاب خریدنے کے پابند ہونگے

اپنی پسند اور اپنی مرضی سے کتاب منتخب کیجئے اور رعایتی قیمت پر خریدیئے

جوں ہم کوئی کتاب طبع کرینگے ہم اپنے مستقل خریداروں کو اس سے تفصیلی طور پر مطلع کرینگے شرائط حسب ذیل ہیں:-

۱- ابتدائی درخواست خریداری کے ہمراہ پانچ روپے بطور پیشگی (ڈپازٹ) کمپنی میں جمع کرانا ہونگے۔ جب بھی آپ خریداری ختم کرنا چاہیں گے، آپ کو یہ رقم واپس کر دی جائے گی۔

۲- ہر کتاب بذریعہ وی پی بھیجی جائیگی۔ اگر کوئی طلب کردہ وی۔ پی واپس ہوگی تو ڈاک خرچ وغیرہ پیشگی میں سے وضع کرلیا جائیگا۔ آیندہ کتاب اسی صورت میں بھیجی جائیگی جبکہ خرچ ڈاک کے نقصان کی رقم وصول ہوجائیگی۔

۳- خریداری کے لیے کوئی مدّت کا کوئی تعیّن نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں اور جتنی قیمت کی چاہیں کتب خرید سکتے ہیں۔

۴- اگر آپ ہماری مطبوعات پچاس روپے کی یکمشت خریدیں گے تو محصول ڈاک بذمہ کمپنی ہوگا۔

۵- تفاسیر اور مخصوص کتابوں یا ان کے سستے ایڈیشنوں پر کمپنی کو کمیشن کی شرح تبدیل کا اختیار ہوگا۔

۶- دوسرے اداروں کی مطبوعہ کتب بھی نسبتاً رعائتی قیمت پر ہم اپنے مستقل خریداروں کو مہیا کرکے دینگے۔ ان کے لیے مزید شرائط یہ ہوں گی :-

(ا) کوئی فحش یا خلاف اسلام کتاب مہیّا نہیں کی جائے گی۔

(ب) ان کتابوں پر ہم ۶½ فی صد سے لے کر ۱۲½ فی صد تک کمیشن دے سکیں گے۔ کمیشن کی شرح کا فیصلہ ہماری صوابدید پر ہوگا۔

(ج) کمیاب اور بیرون پاکستان کی مطبوعہ کتابوں کی قیمت کا فیصلہ حالات کے مطابق ہوگا۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۱ سی۔ شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

ایک سال کی جبری بندش

کے بعد

تحریکِ اسلامی کا خادم

ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی

یکم جولائی ۶۲ء سے

اعلائے کلمۃ الحق کیلئے اپنی پہلی اشاعت

"آزادی نمبر"

پیش کر رہا ہے !

صفحات :- ۲۰۰ ———— قیمت :- ۲ روپے

منیجر "چراغِ راہ" کراچی ۱

الجہاد فی الاسلام

سید ابوالاعلیٰ مودودی

★

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلل و مستند کتاب
- اسلامی جہاد اور غیر اسلامی جنگ کا فرق
- اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانینِ جنگ سے موازنہ
- اسلام میں جہاد کی اہمیت، اس کی حقیقت اور اس کے حدود و شرائط
- غیروں کے طعنوں اور اپنوں کی معذرتوں کا جرأت مندانہ جواب

اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

عمدہ کتابت و طباعت

سائز ۲۰×۲۶/۸ — صفحات تقریباً ۵۵۰

قیمت — اعلیٰ قسم — ۱۰،۵۰ روپے

سستا ایڈیشن ۔ ۷ روپے

★

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور